مقالات شیخ الاسلام

شیخ الاسلام والمسلمین
حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی

اہلسنت وجماعت کا ایک چمکتا روشن ستارہ

علماءِ حق کی سرپرستی میں رواں دواں

گلوبل اسلامک مشن انک
نیویارک، یو ایس اے
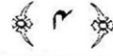
نام کتاب: 'مقالاتِ شیخ الاسلام'

مصنف: شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ عالی

عارفِ مقالات: شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام جیلانی اشرفی

عرضِ ناشر: محمد مسعود احمد سہروردی، اشرفی

کمپیوٹر کتابت: منصور احمد اشرفی

اشاعت اول: رجب المرجب ۱۴۲۵ھ بمطابق اگست ۲۰۰۴ء

اشاعت دوم: ۲۰ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ بطابق ۲۸ مارچ ۲۰۰۸ء

تعداد: ۱۰۰۰

ناشر: گلوبل اسلامک مشن، انک
نیو یارک، یو ایس اے

Published By:

Global Islamic Mission, INC.
P.O. Box 100
Wingdale, NY 12594
U.S.A.
www.globalislamicmission.com

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم صل علی محمد
وعلی ال محمد کما صلیت
علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم
انک حمید مجید ٥
اللھم بارک علی محمد وعلی
ال محمد کما بارکت علی
ابراھیم وعلی ال ابراھیم
انک حمید مجید ٥

عرض ناشر

شیخ الاسلام والمسلمین، حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی، مدظلہ العالی کا شمار عالم اسلام کے جید علماء کرام کی صف میں ہوتا ہے، کہ جنکی انتھک کاوشوں کے نتیجہ میں لاکھوں فرزندانِ توحید، مسلک حقہ سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ سختی سے کاربند ہو کر ایمان اور کمالِ ایمان کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے، رب تعالیٰ اور اسکے پیارے حبیب ﷺ کو راضی کرنے میں کوشاں ہیں۔۔۔آج کے دور کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ جس زمین پر، بلکہ زمین میں جس جگہ بھی، چاہے وہ مسجد ہو یا مدرسہ یا کوئی اور دینی ادارہ ہی ہو، جس کا قبضہ ہے اسی کا قانون، اسی کا حکم اور اسی کا عقیدہ چلتا ہے چاہے اس کا تعلق حق سے دور کا بھی نہ ہو۔ جیسے کہاوت ہے 'جسکی لاٹھی اسکی بھینس'۔ ایسے میں 'حق' کی شمع بلند رکھنا یہ بڑے ہی اولوالعزم نفوس کا کام ہے۔

آج جبکہ اسلاف کی صحیح نمائندگی کرنے والے علمائے حق کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے، اور جو بزرگ ہستیاں اس دنیا سے کوچ فرما رہی ہیں انکا نعم البدل ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل پا رہا ہے۔ ایسے میں ہم دل کی گہرائیوں سے اللہ رب العزت کے حضور دعا گو ہیں کہ پروردگار عالم حضور شیخ الاسلام سمیت موجودہ دور کے علمائے حق یعنی علمائے اہلسنّت و جماعت کی عمروں میں برکت عطا فرمائے اور ان سب کو اپنے اپنے اہل خانہ اور مریدین و معتقدین پر عرصہء دراز تک قائم و دائم فرمائے۔ ﴿آمین﴾

ہمارے ادنیٰ خیال میں ہمیں چاہئے کہ جن جن بزرگانِ دین، پیرانِ عظام اور اساتذۂ کرام سے ہم کسی نہ کسی صورت میں وابستہ ہیں، ان سے عقیدت و محبت

کے ساتھ ساتھ ان کے کام کو یعنی ان کے مشن کو بھی آگے بڑھائیں تاکہ مسلک حقہ کی روشنی دور دور تک پھیلے اور اسکو مٹانے والے عناصر کی کوششیں کبھی بھی بارآور نہ ہو سکیں۔ انہی خیالات کی روشنی میں آج سے تقریباً ۱۰ برس پہلے ہم نے امریکہ میں گلوبل اسلامک مشن کی بنیاد رکھی جسکا مقصد علمائے حق، یعنی علمائے اہلسنّت و جماعت کا تحریری و تقریری پیغام مسلمانوں میں اور بالخصوص اسلام کا پیغامِ حق غیر مسلموں میں عام کرنا تھا۔ یہ بزرگوں کی نظر کرم اور توجہ ہی کا نتیجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے ہم پر کرم فرما کر دین متین اور مسلک حقہ کی خدمت کرنے کا عظیم موقع عطا فرمایا۔

اس سے پہلے اردو ترجمہء قرآن موسوم بہ 'معارف القرآن' جس کے مترجم محدث اعظم ہند، حضور سید محمد محدث کچھوچھوی علیہ الرحمۃ ہیں، اور انہی کی تفسیر، سید التفاسیر المعروف بہ 'تفسیر اشرفی' (پہلا پارہ)، 'مسئلہ قیام وسلام اور محفل میلاد'، اور حضور شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ عالی کی کتابیں، 'محبت رسول روحِ ایمان'، فریضہء دعوت وتبلیغ، دین کامل، حدیث نیت اور حدیث جبرائیل کی شرحیں، 'نظریہء ختم نبوت اور تحذیر الناس'، چالیس احادیث کی شرح، 'الاربعین الاشرفی' اور اسکے علاوہ The Soul of Islam, Decisive Decision, Essentials of Islam, اور انگلش میں کئی اور کتابوں کی اشاعت کا شرف اس ادارے کو حاصل ہو چکا ہے۔ جس کیلئے ہم رب تبارک وتعالیٰ کے بے حد شکر گذار ہیں کہ وہ ہمارے ہی فائدے کیلئے ہمیں ایسے اعمال انجام دینے کی توفیق مرحمت فرما دیتا ہے جو ہمارے لئے آخرت کے سفر کا توشہ بن جاتے ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت، ہمیں دین اسلام اور مسلک حقہ کی مزید خدمت کرنے کے مواقع عطا فرمائے۔ ﴿آمین﴾

زیر نظر کتاب، بنام 'مقالاتِ شیخ الاسلام' (دوسرا ایڈیشن) ہمارے ادارے کی شائع کردہ کتابوں کی فہرست میں ایک حسین اضافہ ہے۔ 'مقالاتِ شیخ الاسلام' کا

تفصیلی تعارف آگے کے مضمون میں، جو جید عالم دین، شیخ الحدیث، حضرت علامہ غلام جیلانی اشرفی صاحب (کراچی، پاکستان) نے قلمبند کیا ہے، موجود ہے۔ اور پھر مقالات خود ہی اپنی اہمیت اور شیخ الاسلام کے قلم کی شان بیان کردینگے۔ یہاں ہم صرف ہلکا سا تعارف تحریر کرنا چاہتے ہیں تاکہ قارئین کی معلومات میں مزید اضافہ ہوسکے۔ یہ مقالات ۳۰ سے ۳۵ سال قبل تحریر فرمائے گئے تھے جو وقتاً فوقتاً انڈیا کے ماہناموں میں کامل طور پر اور قسطوار بھی چھپتے رہے۔۔۔ مختلف سائلین کے سوالات کے جوابات کے طور پر اور وقت کی ضرورت کے پیش نظر یہ مقالات قلمبند کئے گئے تھے۔۔۔ ہوسکتا ہے آج کا کوئی سائل یہ سوال کر بیٹھے کہ آج کا دور تیس سے پینتیس سال پرانے دور سے بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا ہے، لہٰذا اُس دور میں کئے گئے سوالات اور دیئے گئے جوابات کا آج کے دور سے کیا تعلق ہے جو مقالات چھاپنے کی زحمت اٹھائی جارہی ہے؟۔۔۔

تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ یہ بجا ہے کہ آج کا دور اپنے سے پہلے کے دور سے بڑی ہی تیزی سے بہت آگے نکل آیا ہے، مگر جب ہم مذہب اسلام کے تعلق سے ان ذہنوں کا جائزہ لینگے جو بڑی ہی تیزی سے دنیا کی بظاہر ترقی میں اپنے کو بہا کر آگے کی جانب بڑی دور لے گئے ہیں، تو پتہ چلے گا کہ غیر مسلموں کی بات تو علیحدہ ہے، بہت سے مسلمان بھی یہی سوالات کرتے ہوئے نظر آئیں گے جن کے جوابات شروع کے دو مقالات میں مفصل دے دئے گئے ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ چھپوانے کی زحمت کیوں اٹھائی جارہی ہے۔۔۔ تو وہ اسلئے کہ یہ بات ہمارے لئے بڑی ہی باعث سعادت ہے کہ دورِ حاضر کے شیخ الاسلام حضرت سید محمد مدنی اشرفی جیلانی دامت برکاتہم العالیہ کی وہ تحریریں ہمیں شائع کرنے کا موقع مل رہا ہے جن میں تفصیل سے اسلام کی حقانیت، آج کے دور میں اسلامی قوانین کی پہلے

سے کہیں زیادہ ضرورت، تمام ادیان میں اسلام کی برتری، اور رسول اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات کو قرآن وسنت اور عقلی و نقلی دلائل سے کامل طور پر ثابت کیا گیا ہے اور سیر حاصل گفتگو فرمائی گئی ہے۔ جوان باتوں کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں، وہ چاہے مدعیانِ اسلام میں سے ہوں، اسلام کے وفادار نہیں۔ حضرت نے صاف ظاہر فرمادیا ہے کہ طلبِ دنیا کے دریا میں تیزی سے بہنے والے وہ افراد جو دین اسلام کو اپنی مرضی اور آسانی کیلئے ایک نئے اور غلط رنگ میں ڈھالنا چاہتے ہیں، وہ اسلام کے دوست نہیں بلکہ در پردہ اسلام کے دشمن ہیں جنکا مقابلہ جانشین رسول ﷺ یعنی علمائے حق، یعنی علمائے اہلسنّت و جماعت ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

ہمیں چاہئے کہ ان مقالات کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور خود بھی حق و باطل کا فیصلہ کریں۔ دوستو! ایمان کو اس دنیا سے بچا کر لیجانے والا ہی سب سے بڑا کامیاب ہے اور اس دور میں جبکہ ایمان کے دشمن جگہ جگہ موجود ہیں، ہمیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم دین کا علم، صحیح علمائے کرام اور صحیح کتابوں سے حاصل کریں۔ گلوبل اسلامک مشن بھی اسی مشن میں کوشاں ہے کہ اسلام کا صحیح علم عامۃ المسلمین تک پہنچائے اور عامۃ الناس پر اسلام کی حقانیت کو روشناس کرائے۔ اس مشن کی کامیابی کیلئے ہم آپ سے بھی دعاؤں کی درخواست کرتے ہیں۔

مقالات پر مشتمل اس مجموعہ کو یعنی حضرت کے قلم مبارک سے نکلے ہوئے علم دین کے ان موتیوں کو، جن کو شائع کرنے کی اجازت ہمیں حضور شیخ الاسلام نے عطا فرمائی ہے، اس کیلئے ہم انکے بے حد شکر گزار ہیں کہ تھوڑی سی محنت کر کے ہم دین اسلام کے ادنیٰ خادموں میں اپنا نام لکھانے کی سعیٔ مبارک کر لیتے ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ شیخ الاسلام حضرت سید محمد مدنی میاں صاحب کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے اور آپ کا علمی و روحانی فیض تادیر جاری وساری فرمائے۔ ﴿آمین﴾

ہماری کوئی عرض اور کوشش اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہم ان بزرگانِ دین اور علمائے کرام واحبابِ حلقہ کا شکریہ ادا نہ کردیں جنہوں نے اِن خدمات کوانجام دینے میں کسی نہ کسی طرح ہماری رہنمائی ومدد فرمائی ہے۔

ہم عالمی مبلغ اسلام، قائد اہلسنّت حضرت علامہ مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کو، خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ آپ ہمیشہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کرتے تھے اور مفید مشوروں سے نوازا کرتے تھے۔ رب تبارک وتعالیٰ انکے درجات بلند سے بلندتر فرمائے اور حضرت کا روحانی فیض جاری وساری رہے۔۔۔ مسعودِ ملت، حضرت پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب دامت برکاتہم العالیہ جن کے عوام وخواصِ اہلسنّت پر بیش بہا احسانات ہیں اور جو ہر قدم پر ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔ ہم ان کے بھی بے حد شکر گذار ہیں اور دعا گو ہیں کہ رب ذوالجلال آپ کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے۔۔۔ خیر الاتقیاء، شیخ الحدیث حضرت علامہ مفتی نصر اللہ خان صاحب افغانی مدظلہ عالی جو عرصہء دراز سے دین اسلام اور مسلک حقہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، ہم پر بڑی کرم نوازی فرماتے ہیں اور دعاؤں سے نوازتے ہیں، ہم انکے بھی بے حد مشکور ہیں۔۔۔ نمونہء اسلاف، خوبصورت وخوب سیرت، حضرت علامہ مفتی محمد اطہر نعیمی صاحب مدظلہ عالی جنکے پاس بیٹھ کر اٹھنے کو دل نہیں چاہتا، ہمارے لئے کام کرنے کی نئی امنگیں پیدا فرماتے ہیں اور مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر وصحت میں برکتیں عطا فرمائے۔ ﴿آمین﴾

جامعہ نضرۃ العلوم کے جناب حضرت علامہ مفتی الیاس رضوی صاحب، جناب حضرت علامہ غلام جیلانی اشرفی صاحب (شیخ الحدیث) جناب علامہ رضوان احمد صاحب، جناب سید ریاض علی اشرفی صاحب، جوصوت الشرق پبلک اسکول، شاہ فیصل کالونی، کراچی، پاکستان کے مہتمم بھی ہیں، اور تمامی احباب کی ہر دل عزیز شخصیت،

علامہ رجب علی نعیمی صاحب بھی جملہ علماءِ کرام کے ساتھ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جو قدم قدم پر ہماری رہنمائی اور تصحیح فرماتے ہیں۔ خاص طور پر ہم شکر گذار ہیں جناب علامہ غلام جیلانی اشرفی صاحب (شیخ الحدیث) کے، کہ جنہوں نے ایک خوبصورت مضمون 'تعارف مقالات' کے نام سے ہمیں اس کتاب کیلئے لکھ کر عنایت فرمایا۔ ہمیشہ کی طرح ہم جناب محمد فخر الدین علوی صاحب کے بھی شکر گذار ہیں جو وقتاً فوقتاً ہمیں پنی تحریروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ گلوبل اسلامک مشن کی پوری ٹیم، اور خاص طور پر منصور احمد اشرفی جنہوں نے اس پوری کتاب کی کمپیوٹر کتابت سرانجام دی ہے کے شکر گذار ہیں جنہوں نے مختلف مراحل میں ہماری مدد فرما کر اس ادارے کو تمغہء امتیاز کے قابل بنایا۔ چھپائی کے تعلق سے مسرور علی اور سلیم الدین صاحب بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

آخر میں ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت اپنے حبیب ﷺ کے وسیلہء جلیلہ کے طفیل ہماری اس ادنیٰ کوشش کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اسکو ہم سب کیلئے آخرت کا توشہ بنادے اور ہم سب کو بزرگان اہلسنّت سے وابستہ رہتے ہوئے دین اسلام اور مسلک حقہ کی خدمت کرنے کے مزید مواقع مرحمت فرمائے۔

امین بجاہ النبی الکریم والہ واصحابہ اجمعین

ابوالمنصور والمقصود
محمد مسعود احمد
سہروردی، اشرفی

چیئرمین
گلوبل اسلامک مشن، انک
نیویارک، یو ایس اے

۱۲ ربیع اوّل ۱۴۲۹ھ ۔۔۔ بمطابق ۔۔۔ ۲۰ مارچ ۲۰۰۸ء

تعارفِ مقالات

قرآن وحدیث، جسے دانشورانِ امت کتاب وسنت سے تعبیر کرتے ہیں، اسلام کی مبدءِ تاریخ سے آج تک اور اب سے صبح قیامت تک، جب تک اس دھرتی پر مسلمان موجود ہیں، اُن کے جملہ مسائل کا حل، خواہ دینی ہو یا دنیاوی، انفرادی ہو یا اجتماعی، ملکی ہو یا بین الاقوامی، اسی کتاب وسنت میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مقدس کا تعارف خود اس طرح فرمایا ہے۔

۔۔۔ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ ﴿سورۃ الانعام: ۵۹﴾

اور نہ تر، اور نہ خشک، مگر سب ایک روشن کتاب میں ہے۔

۔۔۔۔ اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

۔۔۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔۔۔ ﴿سورۃ النحل: ۸۹﴾

اور ہم نے اتارا ہے تم پر کتاب روشن بیان ہر چیز کا۔

۔۔۔۔ اس سلسلہء عنوان میں مزید قرآنی آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی اپنی کتابِ ہدایت میں سنت کی حیثیت و اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

۔۔۔ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ ۔۔۔ ﴿سورۃ الحشر: ۷﴾

اور جو کچھ دے دیا تم کو رسول نے تو لے لو اسے، اور جس سے روک دیا تمہیں تو رک جاؤ

مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی اِس امت کو یہ پیغام دیا ہے کہ دربارِ رسالت مآب ﷺ سے تمہیں جو کچھ دیا جائے وہ لے لو۔ جس کام کے

کرنے کا حکم دیا جائے وہ کرو۔ جس سے منع کیا گیا اس سے رک جاؤ۔ اسی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی کامل واکمل رضا ہے۔ اس آیت مبارکہ سے رسول اللہ ﷺ کی وہ سنتیں جو احادیث مبارکہ میں موجود ہیں، ان کی شرعی حیثیت کا بھرپور تعین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مستند مفسرین قرآن نے اس آیت کے تحت یہ وضاحت کی ہے کہ یہ آیت مبارکہ اگرچہ مالِ فےَ سے متعلق ہے مگر یہ حکم عام ہے کہ حضور ﷺ جو حکم دیں، چاہے اس کا تعلق اعتقاد سے ہو یا عمل سے، عبادات سے ہو یا معاملات سے، مالی ہو یا غیر مالی، سب کو شامل ہے۔

۔۔۔اس اصول کی تائید میں معروف تفسیریں درج ذیل ہیں:

☆ ۱۔تفسیر بیضاوی ☆ ۲۔تفسیر خازن ☆ ۳۔تفسیر مدارک
☆ ۴۔تفسیر روح البیان ☆ ۵۔تفسیر درمنثور
☆ ۶۔تفسیر جلالین ☆ ۷۔تفسیرات احمدیہ

۔۔۔اسکے علاوہ دیگر حوالہ جات کیلئے بھی مذکورہ آیت کے تحت ان تفاسیر کو ملاحظہ کیجئے:

عملاً امت مسلمہ کے اصحاب علم وفضل کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ازمنہء صحابہ سے آج تک اس امت میں ہمیشہ ہر دور میں ایسے اصحاب علم وفضل موجود رہے ہیں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھرپور علمی وفکری صلاحیتیں ودیعت فرمائیں اور انہوں نے دنیا کے سامنے پیش آنے والے ہر مشکل سے مشکل تر مسئلے کا حل دلائل براہین، بھرپور فکر ونظر، اور کامل واکمل روایتوں ودرایتوں کے ساتھ پیش کیا۔ ان اصحاب علم ودانش میں خلفاءِ راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے علاوہ دیگر معروف صحابہء کرام بھی ہیں۔۔۔ مثلاً: حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن عباس و دیگر متعدد صحابہء کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ایسے ہی تابعین و تبع تابعین میں بہت ہی نمایاں نام امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ، امام مالک اور انکے تابعین،

امام شافعی اور انکے اصحاب، امام احمد بن حنبل و دیگر محدثین۔ یہ قافلۂ علم و فضل یونہی رواں دواں رہا اور زمانۂ جبر وملوکیت میں بھی حق کا نعرہ بلند کرتا رہا۔ اسلامی جغرافیائی سرحدیں وسیع ہوتی رہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے فضل سے اس اُمت میں صاحبانِ دانش و بینش کو پیدا فرماتا رہا، یہاں تک کہ آج کا دور۔

آج کے دور کے حوالے سے کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر ایک چیز بہت نمایاں ہے جس کو ہر شخص محسوس کر رہا ہے۔ اور وہ ہے 'خیر و شر' کے مابین بھرپور ٹکراؤ۔ یہ 'خیر و شر' کی جنگ یوں تو ہر انسانی معاشرہ میں ہے، لیکن شومئی قسمت مسلم معاشرے میں بہت عروج پر ہے۔ آج کی دنیا میں لکھنے پڑھنے کی تمام تر سہولتیں موجود ہیں، سمجھنے سمجھانے کے تمام تر ذرائع و وسائل موجود ہیں، اور یہ ذرائع اور وسائل 'خیر و شر' میں سے ہر ایک کیلئے تبلیغ کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ آج کا دور میڈیا کا دور ہے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کی بھرمار ہے۔ معمولی فہم رکھنے والا انسان بھی بخوبی سمجھتا ہے کہ پرنٹ میڈیا کے مقابلے میں الیکٹرونک میڈیا انتہائی مؤثر ہے۔ اے کاش! کہ مسلم ممالک میں الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے اسلام کا حقیقی پیغام پہنچتا، صحابہ و تابعین کے عظیم کارناموں کا چرچا ہوتا، ائمہ و مجتہدین کے علمی و فکری مواد کا مؤثر بیان ہوتا، اسلاف و بزرگانِ دین کا محبتوں بھرا پیغام پہنچایا جاتا۔۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ ہنوز خواب ہے۔ شاید کبھی مستقبل میں اس کی تعبیر ممکن ہو سکے۔

آج کی دنیا میں علمی و فکری تحریریں، جو تحقیق و تدقیق پر مبنی ہیں، ضخیم مجلدات کی شکل میں اور مختصر کتابچوں اور مؤثر ملفوظات و مقالات کی صورت میں دستیاب ہیں اور ذوق وشوق رکھنے والے طلباء اور علماء اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ آج دنیائے اہلسنّت میں علمائے جدید و قدیم کی تحریریں ضخیم مجلّات اور مختصر کتابچوں کی صورت میں موجود ہونے کے باوجود عوام اہلسنّت میں وہ طبقہ جو مطالعہ کا ذوق وشوق رکھتا ہے انکا

یہ مطالبہ ہے کہ علماء و دانشورانِ اہلسنّت جدید دور کے تقاضوں کے مطابق جدید موضوعات پر مثلاً ۔۔۔ سیاسیاتِ جدید، عمرانیات، اقتصادیات و معاشیات پر اسلام کا نقطۂ نظر قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اہلسنّت میں ایسے اصحاب علم وفضل ہیں جو ان موضوعات پر محققانہ بحث کر سکتے ہیں۔ بس ضرورت ہے توجہ کی ۔۔۔

مختلف موضوعات پر بھرپور علمی وفکری مقالات پیش کرنے والے نامور علمائے کرام ماضی قریب میں اور اب بھی موجود ہیں جنکے مقالات اور تحریروں نے اہل علم و دانش پر اپنا اثر قائم کیا۔۔۔ مثلاً: مقالات علامہ کاظمی رحمہ اللہ، مقالات پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ، مقالات علامہ سعیدی دامت برکاتہم العالیہ اور دیگر علماء وفضلاء کے مقالات۔

سر دست پیش نظر شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی کچھوچھوی مدظلہ العالی کے مختلف موضوعات پر مقالات ہیں۔ ان مقالات کو کتابی شکل میں چھپوانے کا اہتمام محترم ومکرم جناب محمد مسعود احمد صاحب کر رہے ہیں جو گلوبل اسلامک مشن، انک (نیویارک، یوایس اے) کے بانی وسرپرست ہیں۔ جناب محمد مسعود احمد صاحب کے رفیق کار اور میرے نہایت واجب الاحترام دوست، سید ریاض علی اشرفی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں قبلہ مدنی میاں مدظلہ العالی کے ان مقالات پر کچھ تحریر کروں۔ گو میں نے اپنی کم علمی وکم فہمی کی بنیاد پر اور خاص طور پر لکھنے کی صلاحیت بالکل نہ ہونے کی وجہ سے اُن سے معذرت کی مگر اُن کا اصرار تھا کہ میں کچھ نہ کچھ تحریر کروں۔ سو چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں پر مشتمل یہ تحریر بنامِ 'تعارفِ مقالات' پیش خدمت ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے یہ مقالات درج ذیل عنوانات کے تحت ہیں:

﴾۱﴿ ۔۔۔ اشتراکی سوالات کے اسلامی جوابات۔

﴾۲﴿ ۔۔۔ تین سوالوں کا جواب۔

﴿۳﴾--- تحریم اور فلسفہء تحریم۔

﴿۴﴾--- شرح وحواشی فی التحقیق البارع فی حقوق الشارع۔

یہ مختصر رسالہ رسولِ اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات کے نام سے قبلہ مدنی میاں صاحب کے والد ماجد حضور محدث کچھوچھوی رحمہ اللہ کی تحریر ہے۔اسکی شرح اور حاشیہ جناب مدنی میاں کی تحقیق ہے۔

اسکے علاوہ اور دیگر مقالات بھی ممکنہ طور پر اس مجموعے میں شامل کئے جاسکتے ہیں جو ابھی جمع وتدوین کے مراحل میں ہیں۔

مذکورہ بالا موضوعات میں کوئی بھی موضوع ایسا نہیں ہے کہ جس پر مختلف علماء کرام،فضلاءعظام اور دانشورانِ امت نے اظہارِ خیال نہ کیا ہو۔لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ ہر محقق کی تحقیق میں، ہر محرر کی تحریر میں، ہر مستدل کے استدلال میں، ہر مستخرج کے استخراج میں، بلکہ ہر مجتہد کے اجتہاد میں اسکی علمی وفکری صلاحیتوں اور جودتِ طبع کا امکانی حد تک دخل ہوتا ہے۔اور ہر ایک کی تحریر کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے جب ہی تو غالب نے کہا تھا: ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

چنانچہ جنابِ غالب کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مدنی میاں کا انداز ان تحریروں میں جداگانہ،منفرد،علمی،فکری اور بہت عمدہ ہے۔ہر وہ صاحب علم جو تحریر کی دنیا میں قدم رکھے اور طبع آزمائی کرے اور اپنی تحریری کاوشیں دنیا کے سامنے پیش کرے وہ ہمیشہ زندہ وتابندہ رہتا ہے۔کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

یلوح الخط فی القرطاس دھرا وکاتبہ رمیم فی التراب

صفحہ قرطاس پر تحریر ہمیشہ چمکتی دمکتی رہے گی اور لکھنے والا ہمیشہ کیلئے آسودۂ خاک ہوجائے گا۔

---﴿پہلا مقالہ---'اشتراکی سوالات کے اسلامی جوابات'﴾---

فلسفہء اشتراکیت--یہ فلسفہ مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔اشتراکیت، سوشلزم، کمیونزم، مارکس ازم اور غالباً دہریت۔روئے زمین پر انسانوں کو ہمیشہ مسائل ومصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ہر مشکل کے حل کیلئے انسانوں کے سماج میں کچھ لوگ ایسے رہے ہیں جنہوں نے اپنے فہم اور سمجھ کے مطابق اُن کا حل پیش کیا۔ کبھی وہ حل کارگر ہوا اور کبھی نہ ہوا، اور کبھی ہوا تو عارضی ہوا۔

مشاہدات کی دنیا میں ایک طویل سفر کرنے کے بعد آج کی دنیا میں کچھ ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانوں کو پیش آنے والے مسائل کے وہ حل جو انسانوں ہی نے اپنی فہم اور سمجھ بوجھ کے مطابق پیش کئے وہ عارضی ہی رہے۔ جبکہ مستقل حل صرف ان نفوسِ قدسیہ نے پیش کیا کہ جو اُن مسائل کا حل اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے لیکر تشریف لائے۔آج کی دنیا میں یہ حقیقت مسلمہ وثابت شدہ ہے۔

فلسفہء اشتراکیت کا بانی کارل مارکس ہے۔یہ فلسفہ اسی کے نام سے موسوم ہو کر مارکس ازم بھی کہلاتا ہے۔کارل مارکس نے اپنے زمانے میں غریب مزدوروں اور کسانوں پر ہونے والے مظالم کو دیکھ کر انسانیت کے ناطے، ظالموں اور جابروں کے سامنے صف بندی کی کوشش کی۔بدقسمتی سے ظلم کرنے والے طبقے میں مذہب کا نام لینے والے اہل کلیسا بھی موجود تھے۔بلکہ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ اہل کلیسا بھی طبقہء اشرافیہ میں شامل تھے اور انہوں نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے مل کر غریب مزدوروں اور کسانوں پر عرصہء حیات تنگ کر رکھا تھا۔اسی ظلم وجبر کا نتیجہ اشتراکیت ہے۔اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ ظالموں اور جابروں کی صف میں اہل مذہب بھی تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفہء اشتراکیت نے سرے سے مذہب کا انکار اور مذہب کی بیخ کنی کی۔اور اس فلسفہ کے بانی کارل مارکس نے مذہب کی

توہین کی اور مذہب کو افیون سے تشبیہ دی۔

اس پوری بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مارکس ازم کی بنیاد مذہب سے انکار پر ہے۔ تو جس نظریہء حیات میں سرے سے مذہب موجود ہی نہ ہو، وہ نظریہء حیات تادیر قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ بیسویں صدی کے آغاز پر شروع ہونے والا یہ نظریہ، صدی کے اختتام سے پہلے ہی زمیں بوس ہو گیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نظریہ نے ایک کثیر خلق خدا کو متاثر کیا۔

فلسفہ اشتراکیت سے کچھ مسلم زعماء بھی متاثر رہے ہیں۔ اسکا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے مابین اسلامی اشتراکیت اور اسلامک سوشلزم کی ترکیب بھی وضع کی گئی۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم سے بروقت علماء کرام نے اس ترکیبِ فاسد کا رد کیا اور اس سلسلہ میں قائم کیئے جانے والے تمام دلائل کا کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دے کر حق کو واضح کر دیا۔

جس طرح کہ اشتراکی سوالات حضرت شیخ الاسلام مدنی میاں صاحب کے سامنے پیش کیے گئے، وہ سوالات ہیں ہی مذہب کے انکار کی بنیاد پر، جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جب اشتراکیت نے مذہب کا انکار کیا تو ان کے سامنے دین و مذہب کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی اور اس طرح انہوں نے وجودِ باری تعالیٰ کا بھی انکار کیا اور وہ اشتراکی اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ مذہب بھی انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے جس طرح کہ دیگر ضروریات۔ اس موضوع پر مزید کلام کی بہت گنجائش ہے لیکن بحث طویل ہو جائے گی۔

حضرت شیخ الاسلام نے اشتراکی سوالات کے جوابات کیلئے سائلین کو ابتداءً دو خانوں میں تقسیم کیا، پھر مزید تقسیم کیا اور مزید تقسیم کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اسی طرح تقسیم در تقسیم کرتے جائیں تو عقلی طور پر اور بہت سی تقسیمیں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں جن

ہ ذکر طوالت تحریر کا باعث ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ سائلین کو ان خانوں میں تقسیم کئے بغیر ان سوالات کے جوابات دینا ممکن نہیں ہے جو حضرت شیخ الاسلام کے سامنے پیش کئے گئے۔ حضرت شیخ الاسلام نے ان سوالات کے بہترین جوابات از روئے روایات و درایت بہت عمدگی کے ساتھ تحریر فرمائے ہیں اور ہر سوال کے جواب میں مختلف قسم کے سائلین کو پیش نظر رکھ کر اطمینان بخش جواب دیا ہے۔

چونکہ سوالات میں اسلام کے معتقدات و معاملات، ہر دو پر سائل حملہ آور ہوا ہے، چنانچہ حضرت شیخ الاسلام نے دلیل و برہان سے اسلامی معتقدات و معاملات کا دفاع کیا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی اور اسکی روح کے عین مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ﴿آمین﴾

---- ﴿دوسرا مقالہ ---- 'تین سوالوں کے جواب'﴾ ----

یہ ایک مختصر سا مقالہ ہے جو در حقیقت لٹریچر کی دنیا سے وابستہ رہنے والی ایک خاتون نے جون پور شہر سے قبلہ مدنی میاں صاحب کی خدمت میں پیش کئے تھے اور تحریری جواب کی فرمائش کی تھی۔ ان تینوں سوالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ سائلہ نے ان تاریخی کتابوں کا از خود مطالعہ کیا ہے جن میں ہر طرح کا 'رطب و یابس' موجود ہے۔ یا پھر ایسی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہی ہیں جن کے مصنفین نے تاریخی واقعات و حادثات سے محض اپنے فہم کی بنیاد پر نتائج اخذ کئے اور بین السطور ابھرنے والے سوالات تک یا تو ان مصنفین کی نظر ہی نہیں گئی یا ارادۃً ان کے جوابات نہیں دئے جس کا لازمی نتیجہ گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام قبلہ مدنی میاں صاحب نے ان تینوں سوالات کے جواب کیلئے جو تمہیدی مقدمہ قائم کیا ہے اس تمہید میں حقیقتاً ان سوالات کے بطن میں جو مزید کئی سوالات تھے ان کے جوابات موجود ہیں۔ قاری پر اس مقالہ کے پڑھتے ہوئے یہ ساری حقیقتیں منکشف ہونگی۔

---﴿ تیسرا مقالہ---'تحریم وفلسفۂ تحریم' ﴾---

دوسرے مقالہ کی طرح یہ تیسرا مقالہ بھی ایک مختصر مقالہ ہے اور جو مسئلہ اس مقالہ میں زیر بحث ہے وہ بنیادی طور پر رسول اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات سے متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مجموعہ مقالات میں چوتھے نمبر پر ایک تفصیلی مقالہ ہے بنام 'رسول ﷺ کے تشریعی اختیارات' موجود ہے۔ اس مقالہ میں بھی یہ بحث تمام وکمال موجود ہے۔

'تحریم وفلسفہ تحریم' میں قبلہ مدنی صاحب نے عملی وتحقیقی انداز سے اس بحث کو اجاگر کیا ہے کہ قرآن وحدیث میں جہاں کہیں تحریم وتحلیل کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی گئی ہے، وہاں تحریم وتحلیل سے کیا معنی مراد ہے؟ حقیقی یا مجازی۔ اور یہ کہ ان میں سے کون سا معنی مراد لیں تو احادیث میں تعرض پیدا ہوگا۔ اور دفع تعارض کی کیا صورت ہوگی۔ اس پوری بحث سے آگاہی حاصل کرنے کیلئے 'تحریم وفلسفہ تحریم' کو گہری نظر سے مطالعہ کیجئے۔

---﴿ چوتھا مقالہ---'رسول اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات' ﴾---

یہ مقالہ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے، قبلہ مدنی میاں مدظلہ العالی کے والد ماجد رئیس المتکلمین حضور محدث کچھوچھوی جو محدث اعظم ہند کے نام سے مشہور ومعروف

ہیں، انکی خدمت میں ایک استفتاء پیش کیا گیا جسکا بنیادی تعلق رسول اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات سے تھا۔ حضرت محدث اعظم ہند نے بھرپور محدثانہ ومحققانہ شان کے ساتھ استفتاء کا جواب دیا۔ جس حدیث کو بنیاد بنا کر مستفتی نے سوال کیا تھا اس حدیث کو پوری سند اور اس دعویٰ کے ساتھ بیان کیا کہ اس حدیث کے سارے راوی، ثقہ اور رجال صحیح مسلم سے ہیں اور اپنے جواب کو بالترتیب درج ذیل قرآنی آیات سے مستحکم کیا۔

☆ سورۃ الاعراف، آیت ۱۵۷ ☆ سورۃ التوبہ، آیت ۲۹

☆ سورۃ الاحزاب، آیت ۳۶ ☆ سورۃ الحشر، آیت ۷

مزید یہ کہ حضرت محدث کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے اپنے اس جواب کو مستحسن کیا سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے کہ جو احکامات کتاب اللہ سے ثابت ہوں وہ اقوی ہیں، بہ نسبت ان احکامات کے جو سنت سے ثابت ہوں۔ اسلئے کہ وہ قوی ہیں۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے جتنے احکامات اپنے فرمودات کے ذریعے ہمیں عطا کئے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ملنے والے اختیارات کی بدولت ہیں۔ اسی لئے جو حکم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کتاب اللہ میں فرمائے وہ 'فرض واقوی' ہے اور جو حکم رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمائیں وہ 'واجب اور قوی' ہے۔

حضرت شیخ الاسلام نے اپنے اس مقالہ میں اپنے والد ماجد کے اس فتوی کی شرح اور حاشیہ آرائی اور مزید تحقیق وتخریج کی ہے۔ اور جس طرح حضور محدث اعظم ہند نے استفتاء کے جواب میں تحقیقی انداز سے اپنے مدعا کو ثابت کیا اُسی طرح حضرت شیخ الاسلام نے اپنے شرح وحاشیہ میں تحقیق وتدقیق کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ احادیث کی تخریج فرمائی اور مکمل حوالہ جات تحریر کئے ہیں اور رجالِ حدیث پر کلام کیا ہے۔ اسماء الرجال کی مستند کتابوں کا حوالہ دیا ہے، فقہ اور حدیث کے اصولوں سے بحث کی ہے، اصول فقہ اور اصول حدیث کی مسلمہ کتب کا حوالہ بھی موجود ہے۔

قبلہ مدنی میاں صاحب نے اپنے اس تحشیہ میں حاشیہ نمبر ۱۰ کے تحت احادیث
کی اقسام مثلاً: صحیح، حسن، ضعیف، موضوع وغیرہ بیان کرتے ہوئے اہلسنّت کے ایک
معروف مفسر و محدث، حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمہ کی مشہور کتاب
'جاء الحق' کا حوالہ دیا ہے۔ اگر اس کے ساتھ شرح 'نخبتہ الفکر' ابن حجر عسقلانی اور
شرح 'شرح نخبتہ الفکر' ملا علی قاری کا بھی حوالہ دے دیتے تو بہتر ہوتا۔ مختصر یہ کہ شرح و
حاشیہ بہت تحقیقی ہے، علمی و فکری معلومات سے لبریز ہے، اس پر مستزاد یہ کہ آخر میں
تکملہ کے نام سے سوال و جواب پر مشتمل مزید معلومات مندرج ہیں، جس کا موضوع
فن سے گہرا تعلق ہے۔ اس طرح یہ مقالہ رسولِ اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات کے
حوالے سے پڑھنے والے کیلئے نہ صرف بہترین معلومات کا ذریعہ ہے بلکہ اس موضوع
پر مزید تحقیق و تفتیش کرنے کیلئے بنیاد بھی موجود ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم سب کو اس سے استفادہ
کرنے کی توفیق رفیق مرحمت فرمائے۔ ﴿آمین﴾

آج کی دنیا

لٹریچر کی دنیا سے وابستہ ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ آج کی دنیا میں بہت تیزی
سے بدلتے ہوئے حالات، افکار و خیالات پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ جس سے زندگی
میں ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی ہے اور امت مسلمہ عملی زندگی میں اخلاق و کردار کے حوالہ سے
قعر مذلت میں گرتی جارہی ہے۔ اس سے بڑھ کر سانحہ یہ ہے کہ عقیدہ و ایمان کے باب
میں قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح اور تعبیر و توضیح کے باب میں بھی نت نئے افکار و
خیالات پیش کئے جارہے ہیں۔ اندریں صورت، افکار صحیحہ کو افکارِ کاسدہ سے، حق کو
باطل سے، خیر کو شر سے، بلکہ یوں کہئے کہ کفر کو اسلام سے، ممتاز کرنے کیلئے جس علم
میزان کی ضرورت ہے، اہل علم و دانش سے وہ مخفی نہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ

وقت کے علماء کرام، دانشوران عظام اور اصحاب طریقت، امت مسلمہ کی رہنمائی کریں۔
آج کی دنیا میں بد قسمتی سے امت مسلمہ مختلف طبقات میں بٹ چکی ہے۔ایسے میں جب ہم اہلسنّت پر نظر ڈالتے ہیں تو دور دور تک کوئی روشنی نظر نہیں آتی، اگر چہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل و کرم سے باصلاحیت افراد کی کوئی کمی نہیں مگر وجوہات مختلف ہیں جو اہل نظر سے مخفی نہیں۔
آج عوام اہلسنّت میں بہت سی نگاہیں منتظر ہیں ایسے علمی وفکری مضامین و مقالات کے، ملفوظات و کتابوں کے، جو عصر حاضر کا ساتھ دیں اور اصلاحِ احوال، اور تعمیر شخصیت و کردار میں ممد ومعاون ہوں۔۔۔

۔۔۔ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔۔۔

شاید تمہیں نصیب ہوا ے کشتگان شب
لوح افق پر صبح کے آثار دیکھنا

غلام جیلانی اشرفی
کراچی، پاکستان
March 31, 2004

اشتراکی سوالات کے اسلامی جوابات

ہر مجیب کیلئے ضروری ہے کہ وہ جوابات دینے سے پہلے اپنے سائل کی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ لے تاکہ اس کا جواب مقتضائے حال کے مطابق ہو اور اسے غیر فصیح طرز نگارش نہ اختیار کرنا پڑے۔ جملہ سائلین کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

﴿الف﴾ --- وہ سائل جو دائرۂ اسلام میں رہ کر سوال کرے۔

﴿ب﴾ --- وہ سائل جو دائرۂ اسلام سے باہر رہ کر سوال کرے۔

دائرۂ اسلام سے باہر رہ کر سوال کرنے والوں کی بھی دو خانوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

﴿ا﴾ --- وہ سائلین جو ساری کائنات کے وجود کو 'بخت و اتفاق' کا مرہون منت ٹھہراتے ہیں اور کسی ایسی ہستی کا تصور نہیں رکھتے جو کائنات کی 'باشعور خالق' ہو۔

﴿ب﴾ --- وہ سائلین جو بالکل اسکے برعکس عقیدہ رکھتے ہوں اور کائنات کو 'ایک باشعور خالق' کا عطیہ سمجھتے ہیں۔

اس دوسری تقسیم کی شق ثانی کیلئے بھی یوں دو خانے بنائے جاسکتے ہیں۔

﴿ا﴾ --- یہ ان کا خانہ ہے جو کائنات کے 'باشعور خالق' کو اس کی ذات، نیز اسکے جملہ صفات و کمالات میں 'وحدہٗ لاشریک' مانتے ہیں۔

﴿ب﴾ --- یہ ان کا خانہ ہے جو کائنات کے 'باشعور خالق' کی ذات و صفات، یا صرف ذات، یا صرف جملہ صفات، یا بعض صفات میں کسی غیر کو شریک

جانتے، مانتے اور ٹھہراتے ہیں۔

اسی طرح اگر تقسیم در تقسیم کرتے جایئے تو عقلی طور پر اور بھی بہت ساری تقسیمیں ظہور پذیر ہوسکتی ہیں۔ جن کا ذکر طوالت تحریر کا باعث ہے۔

یوں بھی۔۔۔ جس حقیقت کی وضاحت میرا مقصود نظر ہے اس کے لئے یہی مذکورہ بالا تین تقسیمیں کافی ہیں۔۔۔ اگر کوئی سائل 'تقسیم ثانی' کی 'شق اوّل' سے متعلق ہو، یعنی خدا کے وجود کو نہ مانتا ہو۔ اور وہ رسالت ونبوت، امامت وخلافت، جنت ودوزخ، مبداء ومعاد، حور وملک، قبر وحشر اور احکامات اسلامیہ، وغیرہ، وغیرہ سے متعلق سوال کررہا ہو تو اس سے ان موضوعات پر بحث وتمحیص ایک 'قبل از وقت'، مقتضائے حال کے خلاف غیر موثر اقدام ہے۔ ایسی تمام بحثوں کا نتیجہ ہمیشہ غیر مفید رہا ہے۔ اس نوع کی گفتگو کا نتیجہ خیز ہونا ایک 'نادر الوجود' چیز ہے، جس کے پیچھے لگنا وقت ومحنت کا صحیح مصرف نہیں۔

ایسے سائلین سے آغاز سخن ایک ایسی ہستی کے وجود سے ہونا چاہئے جو کائنات کی 'باشعور خالق' ہو۔ اس منزل سے گذرنے کے بعد اسکی توحید اور پھر اسکے بعد اسکی دوسری صفات کو مناسب ترتیب کے ساتھ زیر بحث لانا چاہئے۔

غور فرمایئے کہ کس قدر بے محل چیز ہے کہ ایک شخص خدا کو نہیں مانتا اور آپ اس سے خدا کو منوائے بغیر خدا کی توحید منوانے کے درپے ہیں۔۔۔ ایسے ہی ایک منکر، خدا کی ذات وصفات سے انکار کررہا ہے اور آپ اس سے رسالت ونبوت کے متعلق جھگڑ رہے ہیں، وغیرہ، وغیرہ۔

میرے کلام کا یہ منشاء نہیں کہ ایسے جملہ سائلین سے کسی نوع کی گفتگو ہی نہ کی جائے اور انکے سوال کو سن کر خاموشی کا رویہ اختیار کیا جائے، بلکہ مقصود کلام یہ ہے کہ اپنے کو انکے موضوع کا پابند نہ بنایا جائے۔ بلکہ انکو اپنے موضوع کا پابند کرلیا جائے

اور جہاں سے منکر کے انکار کا آغاز ہو، وہیں سے بحث کی ابتداء کی جائے ۔۔۔ایسی صورت میں لا حاصل باتوں سے نجات مل جائے گی اور منکر کے انکار کے پردے کو بھی چاک کیا جا سکے گا۔۔۔ایسے موقع پر بالکلیہ خاموشی بھی نقصان دہ ہے۔ اس طرح منکر اپنے انکار میں جری ہو جاتا ہے اور اس کے خیالات کا بطلان اس پر واضح نہیں ہو پاتا۔۔۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد میں پروفیسر صاحب کی خاص توجہ چاہوں گا۔ آپ کے توسط سے میرے پاس جو سوالات آئے ہیں وہ 'بقول آپ کے' ترقی پسند کمیونسٹ طبقہ کی طرف سے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام اور کمیونزم میں وہی فرق ہے جو آگ اور پانی میں ہے۔ اسی لئے جو کمیونسٹ ہے، وہ مسلمان نہیں اور جو مسلمان ہے وہ کمیونسٹ نہیں۔ یہاں کمیونسٹ سے مراد وہ حقیقی کمیونسٹ ہیں جو 'تقسیم ثانی' کی 'شق اوّل' کے تحت آتے ہیں۔ لہٰذا وہ غافل و نادان مسلمان جو کمیونزم کے عقائد و نظریات سے بالکل بے خبر ہیں، اور صرف 'کمیونسٹ پارٹی' کو ووٹ دینے سے اپنے کو کمیونسٹ تصور کرتے ہیں، اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

ایسے لوگوں کے جواب میں وہی رویہ اختیار کرنا علمی نقطہء نظر سے سودمند ہے، جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ آپ کا اپنے مکتوب میں یہ اعتراف کہ 'کمیونسٹوں اور مسلمانوں میں بنیادی اختلاف عقیدۂ توحید سے ہوتا ہے'، بتا رہا ہے کہ آپ نے ابھی کمیونزم کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ آپ کو یہ اعتراف کرنا پڑتا کہ اسلام اور کمیونزم کے درمیان توحید سے پہلے، 'وجود خدا' ہی سے اختلاف کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کمیونزم 'لادینی نظریہء فکر' کا حامل ہے جس میں کائنات کے کسی خالق کا تصور نہیں۔ لہٰذا اس کا نظریہ ہر اس نظریئے سے متصادم ہے جسکی اساس دین و مذہب پر ہے، اور جس میں ایک خالق کا تصور پایا جا رہا ہو۔ خواہ وہ تصور کتنا ہی ناقص کیوں نہ

ہو۔۔۔آپ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ اسلام کا فلسفہ اجتماعیت کمیونزم کے فلسفہء اشتراکیت کے مشابہ ہے۔۔۔اسلئے کہ اسلام کے سارے فلسفہ اجتماعیت کا دارومدار اس کے کامل ومکمل 'تصور آخرت' پر ہے۔اسلام نے آخرت کا جو تصور پیش کیا ہے اور اس تصور کی اساس پر انسان کی اخلاقی قدروں کی جو حفاظت فرمائی ہے وہ بے نظیر ہے۔کوئی 'ازم' اس کا جواب نہیں رکھتا۔

اسلام کے نظامِ حیات سے اگر اسکے 'تصور آخرت' کو نکال دیا جائے تو اس کا 'نظام اخلاق وفلسفہء اجتماعیت' درہم برہم ہو جائے اور دوسرے 'ازموں' کی طرح اس کا مقصد بھی کم سے کم عیش ونشاط کی کا مجوئی اور زیادہ سے زیادہ اقوام عالم پر بے محابہ چیرہ دستی کے سوا کچھ نہ رہ جائے۔۔۔کمیونزم، جہاں آخرت کا کوئی تصور نہیں، کہاں اسکا فلسفہء اشتراکیت اور کہاں اسلام کا نظام حیات اور اسکا فلسفہء اجتماعیت!۔۔۔غور فرمائیے کہ اس فلسفے کا جس کی اساس 'دین' ہو، اس فلسفے سے کیا جوڑ ہوسکتا ہے جو 'لادینیت' پر مبنی ہو!

اب آیئے، تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمایئے۔اگر آپ کے فرستادہ سوالات کے سائلین بالفرض 'تقسیم اوّل' کی 'شق اوّل' سے متعلق ہوں۔یعنی مسلمان ہوں، تو انکے سوال کا مقصد زیادہ سے زیادہ ان عقلی حکمتوں کی دریافت ہے جو ان احکامات کے پیچھے ہیں۔اور یہ ظاہر ہے کہ کسی فعل کی حکمت صحیح معنوں میں وہ حکیم ہی سمجھ سکتا ہے جو اس فعل کا فاعل مختار ہے۔اب اگر وہ خود ہی اپنے فعل کی حکمت بیان فرمائے، یا کسی کے ذریعہ واضح کرائے، تو وہ حکمت ایک قطعی حیثیت کی حامل ہوگی۔اور اگر ایسی صورت نہ ہو بلکہ دوسرے حکماء کسی حکیم کے فعل کی حکمتوں کو ظاہر کریں، تو انکی حیثیت ظن وتخمین سے زیادہ نہیں۔اسلئے کہ فعل کسی کا ہے اور حکمتوں کے ظاہر کرنے کی کاوشِ ذہنی کسی اور کی۔لیکن یہ کاوش اشارہ کررہی ہے کہ کسی حکیم کا فعل حکمت سے

خالی نہیں ہوا کرتا۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ ہمارا دماغ اسکی حکمتوں کے سمجھنے سے قاصر رہے، لیکن یہ ناممکن کہ ہم اسکو کسی ایسے کا فعل قرار دے کر، جو صرف حکیم ہی نہیں بلکہ خالق حکمت بھی ہے، اس فعل کے پُر حکمت ہونے سے انکار کر دیں۔۔۔ بہ لفظ دیگر۔۔۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہماری سمجھ بوجھ کی قوت اسکے افعال کی حکمتوں کو سمجھ نہ سکے جس نے یہ قوت پیدا کی ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہماری 'قوت ادراکیہ'، جس سے آج ہم اسکی حکمتوں کی چھان بین کر رہے ہیں، کے پیدا کرنے والے کا کام حکمت سے خالی ہو۔۔۔ الحاصل۔۔۔ کسی کو فاعل مختار، حکیم مطلق بلکہ خالق حکمت مان کر اس کے افعال کو حکمت سے خالی گمان کرنا کوئی صحتمندانہ طرز فکر نہیں۔۔۔ اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ سوالات کے جوابات کے تحت، احکامات اسلامیہ کی جن حکمتوں کی طرف میری جانب سے اشارہ ہوگا، ان کا 'منصوص' ہونا غیر ضروری ہے اور 'حکمت منصوصہ' نہ ہونے کی صورت میں کسی صاحب علم وحکمت کا اس سے اچھی حکمت ظاہر کر دینے کا امکان بہر حال اپنی جگہ پر رہے گا۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ان سوالات کے تیور کو دیکھ کر اس کا انتساب کسی مسلمان کی طرف کرتے ہوئے جی کانپ جاتا ہے۔۔۔ اب اپنا پہلا سوال اپنے ہی الفاظ وعبارت کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے:

> 'خدا سب سے زیادہ متمول ہے۔ دنیا کے دولت مندوں، بادشاہوں اور امیروں کی طرح وہ بھی صرف اپنے ہی حکم کی تعمیل پر زور دیتا ہے۔ جگہ جگہ قرآن میں اس کا یہ ارشاد کہ 'دوسروں کی اتباع مت کرو اور صرف میرے حکم کو مانو'، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ دوسرے متمول لوگوں سے حسد وبغض رکھتا ہے۔'

یہ سوال اس بات کی وضاحت کر رہا ہے، کہ سائل اس منزل سے سوال کر رہا ہے جہاں ایک ہستی کو خدا مان لیا گیا ہے۔ نیز سائل کے ذہن میں ایک ایسی ذات کا

تصور ضرور ہے جو کائنات کی 'باشعور خالق' ہے۔ کسی کو خدا مان لینے کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہے کہ اسکو اپنا حقیقی حاکم، رازق، خالق، مقتدر اعلیٰ، غنی، علیٰ الاطلاق، مختارِ کل اور حکیم مطلق وغیرہ مان لیا گیا ہے۔ اور جب آپ نے اس ہستی کو یہ سب کچھ مان لیا ہے تو لازمی طور پر اپنے کو اس کا محکوم، مرزوق، مخلوق، مقدور، محتاج، مجبور اور اسکی حکمتوں کا مرقع تسلیم کر لیا ہے۔ بندے کی فطرت بندگی ہے اور بندگی اس قوت وتوانائی کے مقابلہ میں کی جاتی ہے جو بندگی کرنے والے پر قہر وغلبہ اور قدرت واستیلاء رکھتی ہو۔ اور وہ بھی ایسے کہ بندہ کو اسکے حکم سے سرتابی کی مجال نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی قوت وتوانائی جسکے اوپر کسی قوت کا تصور نہ ہو، ایسا قہر وغلبہ جسکے اوپر کوئی قاہر وغالب نہ ہو، ایسی قدرت واستیلاء جسکے کسی قدرت واستیلاء کے تحت رہنے کا کوئی واہمہ تک نہ ہو، جس ذات میں مان لیا جائے، درحقیقت وہی خدا ہے۔ اسکے سوا اور جو کچھ عالمِ وجود میں آیا، سب اسی کا فیضانِ کرم ہے۔ خواہ وہ امیر ہو یا اسکی امیری، دولتمند ہو یا اس کی دولتمندی، حاکم ہو یا اس کی حکومت۔۔۔

خیال رہے کہ خدا اور بندے کا تعلق وہ نہیں جو راعی اور رعایا، دنیاوی حاکم اور دنیاوی محکوم، سپہ سالار اور سپاہی، امیر وغریب، ایک معاصر اور دوسرے معاصر، ایک ہمسایہ اور دوسرے ہمسایہ، ایک عالم اور ایک جاہل، ایک انسان اور دوسرے انسان، نیز ایک مخلوق اور دوسری مخلوق کے درمیان ہے۔ بلکہ خدا اور بندے کا تعلق وہ ہے جو ایک مخلوق کو اسکے خالق، ایک مرزوق کو اسکے رازق، ایک مقدور کو اسکے علیٰ الاطلاق قادر، ایک محکوم کو اسکے حقیقی حاکم اور ایک مربوب کو اسکے رب سے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی ذات کو خدا مان کر، اپنے اور اُسکے مابین، اُس تعلق کو نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے کوئی سورج کو مانے اور اسکی روشنی کو نہ مانے، چاند کو تسلیم کرے اور اسکی چاندنی سے انکار کرے، آگ پر ایمان لائے اور اسکی حرارت کا منکر ہو۔۔۔ یا یوں کہہ لیجئے۔۔۔ کہ

ایک ہی وقت میں وجودِ شمس کو بھی مانے اور رات کی موجودگی کو بھی، آگ کو بھی تسلیم کرے اور اس کے ساتھ برودت کو بھی، وغیرہ وغیرہ۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔خدا کو مان کر مذکورہ بالا تعلق کو ماننا ناگزیر ہے۔ اور اس تعلق کو تسلیم کر لینے کے بعد سائل کا سوال 'اہمال سرائی' کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ سائل نے یہ غور نہیں کیا کہ جسکے دل میں جذبۂ بغض وحسد ہوا کرتا ہے، اسکی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے محسود سے بڑھتا جائے اور اس کا محسود گرتا جائے اور اگر وہ خود آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو کم از کم اتنا تو ہو کہ اس کا محسود بھی ترقی نہ کر سکے۔ اسی لئے اگر حاسد اپنی خواہش کے خلاف اپنے محسود کو ترقی کرتا ہوا دیکھتا ہے تو اسکے دل میں ایک قسم کے جلن پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی ہی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ کیا کرے مجبور ہے وہ اپنے محسود کی ترقی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکنے کی قدرت بھی نہیں رکھتا، تو اب جلنے کے سوا اسکے پاس رہ ہی کیا جاتا ہے۔۔۔ یہ ہے بغض وحسد۔۔۔ جو ایسی ہی دو ہستیوں کے مابین ہو سکتا ہے، جن میں ایک خدا اور دوسرا اسکا بندہ نہ ہو۔

۔۔۔نیز۔۔۔ ایک کو دوسرے پر اقتدارِ کلی حاصل نہ ہو۔ خدا اپنے بندے سے حسد کرے، آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ امارت وحکومت سے نوازنے والا کیا امارت وحکومت کو چھین نہیں سکتا؟ کسی کو عزت کی کرسی پر بٹھانے والا کیا اس کو اس کرسی سے اتار نہیں سکتا؟ اگر خدا کا یہی ارادہ ہو جائے کہ کسی حاکم کی حکومت نہ چلے، تو وہ اس کیلئے یہ نہیں فرمائے گا کہ اے لوگو! میری مانو اور کسی کی نہ مانو۔ بلکہ وہ اپنی قدرتِ کاملہ کا وہ کرشمہ دکھائے گا کہ دنیا میں نہ کوئی کسی کا حاکم رہ جائے گا نہ محکوم۔۔۔ لیکن خدا کا یہ ارادہ نہ ہوا بلکہ اس نے اپنی مخلوقات میں بعض کو تختِ حکومت پر بٹھایا، ان کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا اور یہ طاقت دی کہ وہ اپنے خالق کے حکم کے خلاف اپنے ذاتی حکم نافذ کر سکیں۔۔۔ تاکہ دنیا والے دیکھ لیں ان نفوسِ قدسیہ کو جو

کڑی سے کڑی منزل میں بھی خدا ہی کے آگے جھکنا جانتے ہیں اور ظاہر ہو جائے کہ کون خدا کا بندہ ہے اور کون طاغوت کا غلام۔۔۔سائل اگر بغض وحسد کی حقیقت کو سمجھ لیتا تو ہرگز ہرگز ایسا عامیانہ سوال نہ کرتا۔خدا کو متمول کہنا بھی سائل کی جہالت ہے۔خدا متمول نہیں بلکہ 'خالق تمول' ہے۔۔۔۔ جہاں جہاں تمول ملے گا اسی کے فیضانِ تخلیق کا عطیہ ہے۔۔۔۔یاد رہے کہ امت مسلمہ کے اندر یہ مسئلہ 'اجماعی' ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء 'توقیفی' ہیں۔لہٰذا اس کو کسی نام سے موسوم کرنا اسلامی نقطہء نظر سے ناروا ہے، جب تک وہ اسم شرعاً 'منقول' نہ ہو۔۔۔۔اس سوال کو دیکھ کر مجھے گنگا الٹی بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔سوال کا لب ولہجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ:

'جب خدا ہی ساری کائنات کا خالق اور سب کا حقیقی مالک ہے اور اسی نے دولتمندوں کو دولت، امیروں کو امیری، بادشاہوں کو بادشاہی عطا فرمائی۔اور ان امیروں، دولتمندوں کو اور بادشاہوں کو جسمانی وروحانی اور ظاہری وباطنی ساری نعمتیں اسی نے عنایت کی ہیں۔۔۔الحاصل۔۔۔انکے پاس جو کچھ ہے سب اسی کی دین ہے، تو پھر انکو حق کیا پہنچتا ہے کہ یہ خدا کے قانون کے مقابلہ میں کسی قانون کا اختراع کریں اور خدائی نظام کے متوازی کسی نظام کی تشکیل کریں! اسی طرح خدا کی دوسری مخلوقات کو کیا حق پہنچتا ہے کہ جو ایسوں کے قانون کے آگے سر جھکائیں، جنکے قوانین خدائی قانون سے متصادم ہوں! وجود پائیں کسی سے، رزق کھائیں کسی کا، زندگی حاصل کریں کسی سے اور حکم مانیں کسی اور کا۔آخر یہ کہاں کی وفاداری ہے؟ جب ہم خدا ہی کے بندے ہیں تو ہمیں اسکی غیر مشروط اطاعت کرنی چاہیئے۔'

سوال کا صحیح رخ تو یہ تھا جو میں نے پیش کیا۔لیکن سائل نے اس نقشے ہی کو الٹ دیا۔۔۔۔کسی نے سچ کہا ہے۔

وحشت میں ہر ایک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے

۔۔۔اب اس سائل کا دوسرا سوال ملاحظہ کیجئے:

'نماز پڑھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں عبادت کرنے والے کو باطہارت رہنا، پاک وصاف کپڑے پہننا، پاک و صاف جگہ پر عبادت کا انتظام کرنا اور دن بھر میں پانچ مرتبہ عبادت کیلئے وقت نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ اس مشینی دور میں جبکہ انسان اور خاص کر غریب و مزدور طبقہ صرف ایک وقت کے کھانے کیلئے صبح سے شام تک محنت میں لگا رہتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ باطہارت رہ سکے؟ نماز کیلئے پاک وصاف کپڑے مہیا کر سکے؟ کارخانوں کے غلیظ ماحول میں عبادت کیلئے جگہ نکال سکے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دنیاوی تگ ودو میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے حاضر ہو؟ یہی وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ نماز کو فرض تو ضرور سمجھتا ہے مگر اسکو پورا نہیں کر سکتا۔ نماز صرف وہ شخص ادا کر سکتا ہے جس کو معاشی خوش حالی حاصل ہو یا پھر وہ معاشی خوش حالی سے مستغنی ہو۔'

جی چاہتا ہے کہ اس سوال کے جواب کا آغاز اقبالؔ کے اس شعر سے کروں:

'یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات'

اقبالؔ کے اس شعر کی صداقت پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔۔۔قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی جماعت، سرمایہ داروں، خوشحالوں، ٹاٹاؤں اور برلاؤں کی جماعت نہیں تھی، بلکہ اس جماعت کی اکثریت، مفلوک الحال، ستم خوردۂ روزگار، اکثر اوقات بھوکے رہنے والے، پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے اور گلیم پوش افراد پر مشتمل تھی۔

اسکے باوجود، قیصر وکسریٰ کی شوکت وسطوت بلکہ ہر طاغوتی طاقت ایسا لرزتی اور کانپتی تھی جیسے ہوا کے ایک نرم و نازک جھونکے سے تارِ عنکبوت تھرتھرا اٹھتا ہے۔ اسکا واحد سبب اس کے سوا کیا تھا کہ اس مقدس جماعت کا ہر فرد خدا کا سچا بندہ ہو چکا تھا۔

اور اب کسی طاقت کی مجال نہ رہی کہ اسے اپنا بندہ بنا سکے۔۔۔ خدا کا سچا بندہ بن کر کوئی دیکھے تو سائل کیلئے جو کام نہایت دشوار ہے اس کیلئے آسان ترین ہو جائے ۔۔۔ یہ اسلام ہی ہے کہ اس کی اکثریت ہمیشہ غریب رہی اور ہمیشہ غریب رہے گی۔ تاکہ دنیا کے سامنے یہ حقیقت آجائے کہ اسلام کی اساس اور اسکا فروغ سرمایہ داری اور دنیاوی اقتدار پر نہیں۔ صرف حقانیت اور صداقت پر ہے۔ لہٰذا اس کے دائرے میں سمجھ بوجھ کر آنے والا صداقت پسند اور حق پرست ہی ہو سکتا ہے۔۔۔ اگر آج کا بدقسمت مسلمان نمازوں سے کوتاہی برت رہا ہے تو اس کی وجہ اس کی غربت نہیں بلکہ اس کا سبب مذہبی جذبات کا فقدان اور خدا کے حقوق، نیز اپنی عبدیت کی حقیقت کا عدم شعور ہے۔۔۔ مسلمانوں کا جو بڑا طبقہ سائل کو بے نمازی دکھائی پڑ رہا ہے تو اسکے خدا کے آگے سر نہ جھکانے کا سبب وہ نہیں ہے جو سائل سمجھ رہا ہے، بلکہ وہ ہے جسکی طرف میں ابھی ابھی اشارہ کر چکا ہوں۔۔۔ خدا کے آگے پانچ وقت نہ جھکنے والے مسلمانوں کی اس سے عبرتناک سزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھیں نہ جانے کتنے درباروں میں اور نہ جانے کتنی مرتبہ سرِ اطاعت خم کرنا پڑتا ہے۔۔۔

مسلمانوں کی اسی عبادت کا یہ اثر تھا کہ آج برطانیہ کے دور کی جتنی ملیں موجود ہیں، سب میں مل کے اندر مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ ان مساجد کی ساری ضروریات کی کفالت مل کے ذمہ ہے۔ پتہ چلا کہ غیر مسلمین بھی اس عبادت کا اپنے طور پر احترام کرتے رہے۔ اب آج مسلمان ہی اسکا احترام نہ کرے تو کسی اور کو کیا پڑی ہے کہ ان کیلئے مسجد بنوا کر زبردستی نماز پڑھائے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اگر سارے مل کے مزدور جو مسلمان ہیں

،نماز پنج وقتہ کے پابند ہو جائیں تو مل کا مالک مجبور ہوگا کہ وہ انکے مذہبی جذبات کی قدر کرے اور پھر وہی انتظام کرے جو برٹش دور کی ملوں میں آج بھی ملتا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ نماز پڑھنے والے کیلیئے دنیا کی بڑی سے بڑی مصروفیت بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اور وہ بہر حال اپنی پنج وقتہ نمازوں کیلیئے چند منٹ نکال ہی سکتا ہے۔ جبکہ پنج وقتہ نمازوں میں سے کوئی ایسی نماز نہیں جس کا پورا وقت ایک گھنٹے سے کم ہو۔ ایک گھنٹے کے اندر چند منٹ کا نکال لینا کون سا مشکل کام ہے!

رہ گیا طہارت کا مسئلہ۔۔۔ طہارت کیلیئے اسلام میں تین ذرائع ہیں۔ اس میں اوّل الذکر دو، اصل کی حیثیت رکھتے ہیں اور تیسرا فرع کی۔ اوّل غسل، دوم وضو، سوم تیمّم۔ تیمّم غسل کی بھی فرع قرار پاتا ہے اور وضو کی بھی۔۔۔ اسکے متعلق فقہی احکام معلوم کرنے کیلیئے بہارِ شریعت، قانونِ شریعت وغیرہ دیکھیئے۔ غسل و وضو پانی سے ہوتا ہے اور تیمّم ہر اس چیز سے جو زمین کی جنس سے ہو۔ ہر اس چیز کو زمین کی جنس سے کہا جائے گا، جو آگ سے جل کر، نہ راکھ ہو، نہ پگھلے اور نہ نرم ہو۔ مثلاً مٹی، گرد، ریت بالو، چونا، سرمہ، ہرتال، گندھک، مردہ سنگ، گیرو، پتھر، زبرجد، فیروزہ، عقیق، اور اس کے علاوہ دوسرے جواہر۔ ان تمام چیزوں پر تیمّم ہو جائے گا، خواہ ان پر غبار نہ ہو۔ اسی طرح بھیگی مٹی (جبکہ مٹی غالب ہو) لکڑی اور کپڑے (جسکے اوپر اتنی گرد ہو کہ ہاتھ رکھنے سے نشان پڑ جائے)، گچے کی دیوار، پکی اینٹ، زمین اور جل کر سیاہ یا راکھ ہو جانے والے پتھر پر بھی تیمّم کر سکتے ہیں۔۔۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جس زمین پر نجاست گری اور خشک ہو گئی، اس سے تیمّم نہ ہوگا، اگرچہ نجاست کا اثر باقی نہ ہو۔۔۔ اگر۔۔۔ نجاست کے گرنے اور پھر اس کے اسی طرح خشک ہو جانے کا علم یقینی ہو، جو بغیر مشاہدہ کے حاصل نہیں ہوتا، صرف شبہہ اور وہم سے کچھ نہیں ہوتا۔

طہارتِ جسمانی کی شرعی صورتوں کو سامنے رکھیے اور بتایئے، کیا کوئی ایسی

صورت بھی عالم وقوع میں آسکتی ہے جس میں بدنی طہارت کے کسی ذریعہ کے حصول کے تعذر واستحالہ کے وقت کوئی دوسرا ذریعہء طہارت میسر نہ آسکے۔۔۔بالفرض۔۔۔ایسی صورت آ بھی جائے کہ کسی مقام پر طہارت کا حصول متعذر و مستحیل ہو، جب بھی یہ اجازت نہیں کہ اس کو ترکِ صلوٰۃ کا بہانہ بنایا جائے۔ ایسوں کیلئے نماز کیلئے قلبی طہارت کافی ہے۔عورتوں کے بعض حالات اس سے مستثنیٰ ہیں۔(تفصیل کیلئے کتب فقہ دیکھئے)۔

اس پر طہارتِ لباس کو بھی قیاس کر لیجئے۔ بالفرض اگر کسی کو پاک و طاہر لباس میسر نہ ہو، نیز میسر نہ آسکے تو اسکو جیسا اور جتنا میسر آئے اسی سے ستر پوشی کرے اور نماز پڑھے اور اگر بالفرض کپڑا ہی میسر نہ آئے اور گھاس پھوس پتے وغیرہ سے بھی ستر پوشی ممکن نہ ہو تو برہنہ ہی نماز پڑھے۔ایسی صورت میں خشیت الٰہی کی وہ چادر ہی اس کیلئے کافی ہے جو اسکے دل و دماغ کو محیط ہے۔مگر ایسی صورت میں کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ کر نماز پڑھے اور اشارہ سے رکوع وسجدہ کرے۔اب رہ گیا جگہ کی طہارت کا مسئلہ تو اسلامی نقطہء نظر سے ہر وہ جگہ نماز پڑھی جاسکتی ہے جہاں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو۔۔۔نجاست کے باب میں بھی اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ نجاست کی دو قسمیں ہیں: نمبر۱، نجاست غلیظہ۔نمبر۲، نجاست خفیفہ۔

۔۔۔مندرجہ ذیل نجاستیں، نجاست غلیظہ ہیں:

﴿۱﴾۔۔آدمی کے بدن سے نکلی ہوئی ہر وہ چیز جس سے وضو یا غسل جاتا رہے۔
(تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے)

﴿۲﴾۔۔ہر خشکی کے جانور کا بہتا ہوا خون، خواہ جانور حرام ہو یا حلال۔

﴿۳﴾۔۔مردار کی چربی اور اس کا گوشت۔

﴿۴﴾۔۔ہر حلال چوپائے کا پاخانہ۔

﴿۵﴾۔۔گھوڑے کی لید۔
﴿۶﴾۔۔جو پرندا اونچا نہ اُڑے: جیسے مرغی اور بطخ، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، ان سب کی بیٹ۔
﴿۷﴾۔۔حرام چوپائے: جیسے کتا، بلی، شیر، چیتا، لومڑی، بھیڑیا، گیدڑ، گدھا، خچر، ہاتھی، سور، ان سب کا پیشاب، پاخانہ۔
﴿۸﴾۔۔ہر قسم کی شراب اور نشہ والی تاڑی اور سیندھی۔
﴿۹﴾۔۔سانپ کا پاخانہ و پیشاب اور اس جنگلی سانپ اور جنگلی مینڈک کا گوشت جن میں بہتا خون ہوتا ہے۔اگرچہ ذبح کئے گئے ہوں۔یوں ہی انکی کھال اگرچہ پکائی گئی ہو، یعنی مدبوغ کی گئی ہو۔
﴿۱۰﴾۔۔سور کا گوشت، ہڈی، کھال اور بال۔اگرچہ ذبح کیا گیا ہو۔
﴿۱۱﴾۔۔ہاتھی کے سونڈ کی رطوبت اور شیر، کتے، چیتے اور دوسرے درندے چوپائیوں کا لعاب

۔۔۔مندرجہ ذیل چیزیں نجاست خفیفہ ہیں۔۔۔

﴿۱﴾۔۔جن جانوروں کا گوشت حلال ہے ان کا پیشاب۔
﴿۲﴾۔۔گھوڑے کا بھی پیشاب۔
﴿۳﴾۔۔جن پرند کا گوشت حرام ہے (خواہ وہ شکاری ہو یا نہ ہو) جیسے کوا، چیل، شکرا، باز، بہری، ان سب کی بیٹ۔
﴿۴﴾۔۔حرام جانوروں کا دودھ، گھوڑی کے دودھ کے سوا جو پاک ہے، لیکن کھانا جائز نہیں۔نجاست غلیظہ اگر کپڑے پر ایک درہم کی مقدار سے کم ہو تو اسکو پہن کر نماز ہو جائے گی، گو خلافِ سنت ہے۔اور اگر ایک درہم کی مقدار میں ہو تو اس کا دھونا واجب ہے، لہٰذا اس کو پہن کر نماز اگر پڑھی گئی تو پھر دوبارہ نماز لوٹانا واجب ہے۔اور اگر ایک درہم کی مقدار سے زیادہ ہو تو دھونا فرض ہے۔بغیر دھوئے اگر اسی کو پہن کر نماز پڑھی تو نماز نہ ہوگی۔۔۔رہ گئی نجاست خفیفہ تو یہ کپڑے کے جس حصے میں لگے اگر اس حصے کی

کبھی ہماری مسجدوں کو آ کر نہیں دیکھا ورنہ اس پر ظاہر ہو جاتا کہ نمازیوں کی اکثریت غریبوں پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔خوشحال لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ پتہ چلا، نہ خوشحالی نماز پڑھاتی ہے اور نہ غربت نماز سے روکتی ہے۔جس کے دل میں خدا کا خوف اور اپنی بندگی کا احساس ہے، وہ کبھی نماز کو فراموش نہیں کرسکتا، خواہ امیر ہو یا غریب۔اور جسکے دل میں یہ خوف واحساس نہ ہو، وہ ہمیشہ پہلوتہی کرتا نظر آئے گا، خواہ امیر ہو یا غریب۔ لٰہذا امارت وغربت کو 'ادائے صلوٰۃ' یا 'ترک صلوٰۃ' کا معیار بنانا قطعی صحیح نہیں۔

۔۔۔اب سائل کا تیسرا سوال ملاحظہ کیجئے:

'روزے میں سحر اور افطار کے درمیان کسی چیز کا کھانا یا پینا جائز نہیں ہے۔ اسکے معنیٰ یہ ہے کہ روزے دار سحر کو خوب پیٹ بھر کے کھالے اور دن میں عبادتِ الٰہی میں مشغول رہے، تا کہ صحیح معنوں میں روزہ ادا کر سکے اور پھر افطار کے وقت اس کیلئے تیار غذا موجود ہو۔اب آپ غور کیجئے کہ اس صنعتی ترقی یافتہ دور میں غریب مزدور طبقہ کس طرح ان شرائط کو پورا کرسکتا ہے۔انکو اپنی روٹی کے حصول کیلئے دن بھر سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور اس دوران میں وہ بغیر کچھ کھائے پیئے اپنی توانائی باقی نہیں رکھ سکتا۔۔۔

جواباً علماء یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے 'صائم بالنہار' اور 'قائم باللیل' رہ کر بڑی بڑی لڑائیوں میں فتوحات حاصل کی ہیں۔ اسلئے اس دور میں بھی روزے کو محنت وجانفشانی کیلئے ایک بہانہ بنانا غلط بات ہے۔۔۔معترضین یہ کہتے ہیں کہ وہ قدیم دور مذہبی جذبات اور فتح وکامرانی کیلئے جدوجہد کا تھا۔روزہ وعبادت مقابل کے مذہب والوں پر ایک اچھا اثر ڈالتے تھے۔لیکن یہ دور عقل وفراست (Rationalism) کا ہے۔نہ کسی کو کسی پر فتح حاصل کرنا ہے اور نہ کسی کو مرعوب کرنا ہے تو ایسی صورت میں روزہ ایک بے معنی سی چیز ہے۔اگر اسلام اسکو باقی رکھنا چاہتا ہے تو صرف وہ لوگ اسکو

باقی رکھیں گے جو سرمایادار ہوں۔ جن کو دن میں دو مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہے۔گزارش ہے کہ اسکے جواب میں اولیاء اور صوفیاء کی مثالیں نہ دی جائیں۔

طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک کسی چیز کے کھانے، پینے وغیرہ سے اپنے نفس کو روکے رکھنے کا نام شرعی اصطلاح میں روزہ ہے۔ رہ گئے غروبِ آفتاب سے طلوع صبح تک کے اوقات، تو ان میں ہر شخص کو جائز چیز جائز مقدار میں کھانے پینے کی اجازت ہے۔ اور صرف یہی نہیں کہ اجازت ہے بلکہ کچھ نہ کچھ نا کھانا پینا بھی ممنوع ہے، یہاں تک کہ افطار نہ کرنا تو بڑی بات، اس میں تاخیر کرنا بھی شرعی نقطۂ نظر سے غیر مستحب ہے۔ جو بھی میسر آئے، فوراً، غروبِ آفتاب کے بعد اس سے افطار کر لے، خواہ وہ پانی ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح سحری کو بھی بہت ساری برکتوں کا سرچشمہ قرار دے کر بتا دیا گیا ہے کہ اس سے محرومی بہت ساری برکتوں سے محرومی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ افطار و سحری کسی میں بھی شرب و طعام کی کوئی مقدار متعین نہیں کی گئی ہے، کہ اس سے کم نہ ہو۔ یہ تو ہر شخص کے حالات پر ہے جس کو جتنا میسر آئے۔۔۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جن کو دن کے دو وقتوں کیلئے کھانا مل جاتا ہے، وہ اس کو رات کے دو وقتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو دن میں صرف ایک وقت کے کھانے کا انتظام کر پاتے ہیں، اپنے دن کے وقت کے کھانے کو رات کے وقت کا کھانا بنا سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی کیلئے دن کے صرف ایک وقت کا کھانا اس کیلئے کسی نہ کسی درجہ میں اتنی طاقت و توانائی کا باعث ہو سکتا ہے، جس سے وہ دنیاوی کاروبار چلا سکے، محنت و مزدوری کر سکے، تو اس کیلئے اسی مقدار میں رات کے ایک وقت کا کھانا اسی طاقت و توانائی کا سبب ہوگا۔۔۔ یہی حال انکا بھی ہے جو دن میں دو بار کھاتے ہیں کہ جب دن کا دو بار کھانا ان کی محنت و مشقت کیلئے ان کو معتد بہ قوت بخش دیتا ہے، تو یہی کھانا اگر رات کے دو وقتوں میں کھایا جائے،

جب بھی وہی طاقت میسر آئے گی ۔۔۔ الحاصل ۔۔۔ ایک شخص جس قسم کی جتنی غذاؤں کو دن میں اپنے بدن میں پہنچا سکنے کی قدرت رکھتا ہے، اسی قسم کی وہ اتنی ہی غذاؤں کو بھی مختلف اوقات میں بدن کو دے سکتا ہے۔

اس مختصر سی تمہید نے یہ بات واضح کر دی کہ سائل کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ روزہ وہی رکھ سکتا ہے جسے دومرتبہ پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہو۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ غرباءِ مسلمین زیادہ تر روزے دار نظر آتے ہیں بہ خلاف خوشحال حضرات کے۔ غریب کو تو فاقہ کی کسی حد تک عادت ہو جاتی ہے، لیکن خوشحال فاقہ سے کم آشنا ہوتے ہیں۔ روزہ دراصل غریبوں کا نہیں، خوشحالوں کا امتحان ہے۔ پتھر پر سونے والے کو پتھر پر سلایا جائے تو کون سی آزمائش ہوئی؟ ہاں اگر کسی قالین و مخمل پر سونے والے کو پتھر پر سلا دیجئے پھر اسکی کروٹوں کو شمار کیجئے۔ نیند تو بڑی بات، جھپکی تک نہیں آسکتی۔

معلوم ہوا کہ اس مقام پر بھی 'ترکِ صوم' و 'ادائے صوم' کا معیار غربت و امارت کو ٹھہرانا بڑی کوتاہ نظری کی بات ہے۔ یہاں بھی ان دونوں کی اساس اسی خوف و احساس کے عدم و وجود پر ہے۔ جس کی طرف دوسرے سوال کے جواب میں اشارہ گذر چکا ہے۔

سائل کے سوال سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے عبادتِ الٰہی کے وسیع مفہوم کو نہیں سمجھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائل کے نزدیک، عبادتِ الٰہی صرف گوشوں میں بیٹھ کر تسبیح و تہلیل کرنے اور الگ تھلگ فرائض، نیز نوافل پر نوافل پڑھنے کا نام ہے۔ حالانکہ یہ امور عبادت کے وسیع ترین مفہوم کا ایک حصہ ہیں ۔۔۔ اسلام کے نزدیک ہر وہ کام عبادتِ الٰہی ہے جسے خدا اور رسول کے بنائے ہوئے قانون کے تحت انجام دیا جائے۔ اسی لئے مومن کا کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، روزی کمانے کیلئے محنت و مشقت کرنا، بچوں سے پیار کرنا، ازواج سے محبت کرنا، والدین کی عزت کرنا، ہمسائے

کا خیال رکھنا، ان سب کے حقوق کا لحاظ رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔۔۔ یہ تمام چیزیں عبادتِ الٰہی ہیں، بشرطیکہ قوانین اسلامی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ امور انجام دیئے جائیں۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔ مومن کی زندگی کا ہر وہ لمحہ، جو خدا کے قانون سے غافل نہیں ہونے دیتا، عبادت ہے۔ خواہ وہ مومن مسجد میں ہو یا خانقاہ میں، بازار کے ہنگاموں میں ہو یا مشینوں کی گھما گھمی میں ہو۔۔۔ ترکِ دنیا یہ نہیں کہ دنیا سے الگ ہو جاؤ، ترکِ دنیا یہ ہے کہ دنیا میں رہو لیکن 'خالق دنیا' سے غافل نہ ہو جاؤ۔

اس وسیع مفہوم کو سامنے رکھنے والے پر یہ بات واضح ہے کہ 'روزہ دار' دنیا کے تمام کاروبار میں رہ کر بھی عبادتِ الٰہی سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اسکا ہر لمحہ عبادتِ الٰہی میں مشغول ہے، بشرطیکہ وہ قانونِ اسلامی کا عملاً احترام کرتا رہے اور وہی کام کرے تائید شرعی جس کی پشت پناہ ہو۔ جب یہ صورت ہے تو اسکا روزہ صحیح معنوں میں روزہ اور وہ صحیح معنوں میں روزہ دار ہے۔ خواہ وہ تسبیح و تہلیل اور دیگر نوافل کی سمجھی بوجھی صورت کو اپنائے یا نہ اپنائے۔ نیز گوشہ نشینی وعزلت گزینی اختیار کرے یا نہ کرے۔۔۔

بیشک افطار کے وقت افطار کیلئے حسب استطاعت چیز کی موجودگی درکار ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس چیز کے مہیا کرنے کیلئے دن کے اوقات کی ساری جائز کوششیں عبادتِ الٰہی ہی ہیں۔

سائل نے معترضین کی طرف سے اس حقیقت کا اعتراف کرلیا ہے کہ:

> 'قدیم دور مذہبی جذبات اور فتح وکامرانی کی جدوجہد کا تھا۔ روزہ وعبادت مقابل کے مذہب والوں پر ایک اچھا اثر ڈالتے تھے'۔۔۔

حیرت ہے کہ اس اعتراف کے بعد، نیز عبادت کی اس اثر اندازی کو تسلیم کرلینے کے بعد، سائل اس کی ضرورت کا منکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائل اسلام کو فقط ایک مذہب اور دھرم سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اسلام ایک کامل دین اور مکمل

دستورِ حیات ہے۔جس میں دنیاوآخرت کی زندگی کا کوئی ایسا معمولی سا بھی گوشہ نہیں جس کیلئے روشنی نہ ملتی ہو۔اسلام دوسرے مذاہب اور دھرموں کی طرح نہیں جو اپنی مخصوص عبادت گاہوں کی چہاردیواری تک محدود ہیں۔اوراس چہاردیواری کے باہر اپنے ماننے والوں کو پوری آزادی دے کر خود دامن جھاڑ کر الگ ہوجاتے ہیں۔ اسلام مذہب وسیاست میں ایک ایسا حسین امتزاج پیش کرتا ہے، نیز دنیاوآخرت کو ایسا مربوط کردیتا ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ اس کی ہدایتوں سے خالی نہیں۔اس کا قانون اگرایک 'زاہد شب زندہ دار' کیلئے ہے تو اسی طرح میدانِ جنگ میں لڑنے والے سپاہی کیلئے بھی ہے۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔اسلام نے انسانوں کوانکی ملکی،شہری،اجتماعی،انفرادی،داخلی، خارجی،دینوی،آخروی،وغیرہ کسی زندگی میں بھی انھیں مطلق العنان نہیں کیا ہے بلکہ انسانی حیات کے ہر ہر شعبہ کیلئے اسلام مینارۂ ہدایت رہا ہے۔اس یقین واذعان کے ساتھ کہ اسی کا بتایا ہوا راستہ صحیح وسالم اور انسان کواس کی دنیاوآخرت کی ہر زندگی میں نجات کی طرف لیجانے والا راستہ ہے۔اسکے سوا سارے راستے ہلاکت کی طرف لیجاتے ہیں۔۔۔تو جس طرح پہلے دور میں ضرورت تھی کہ اسلام کے پاکیزہ اصولوں کا اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ سے انسانی دل ودماغ پراثر ڈالا جائے اورانکے دل و دماغ کی سرزمین سے انکے خودساختہ،ہلاکت کی طرف لیجانے والے مذہبوں اور دھرموں کی بنیادیں اکھاڑ پھینکی جائیں اور وہاں پراسلامی ضابطۂ حیات کا تسلط جما کر اسلام کی فتح وکامرانی کا پرچم لہرایا جائے۔۔۔اسی طرح اس دور میں بھی اسکی ضرورت ہے کہ انسان کے دل ودماغ سے باطل اصولوں کے پرچم کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سرنگوں کر کے وہاں اسلامی قوانین کے علم کونصب کیا جائے اور جس طرح اس دور میں اسکی ضرورت ہے اسی طرح آنے والے دور میں بھی اسکی حاجت رہے گی۔اور جب تک

اسکی ضرورت رہے گی، مسلمانوں کی جدوجہد بھی ہوتی رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہی تو کہیں گے کہ آج تیروتبر اور سیف وسنان کا زمانہ نہیں، لیکن نوکِ قلم اور سیف زبان کا زمانہ تو نہیں ختم ہوا۔۔۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔قدیم دور بھی اسلام کی فتح وکامرانی کیلیئے جدوجہد کا دور تھا۔ اور یہ موجودہ دور بھی، نیز آنے والا دور بھی۔۔۔ یوں ہی جس طرح قدیم دور مذہبی جذبات کا دور تھا، اسی طرح آج کا بھی دور مذہبی جذبات کا دور ہے۔ اور ہر دور مذہبی جذبات کا دور رہے گا۔ مذہب انسان کی فطرت ہے۔ جب تک انسان اپنے فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھے گا، مذہبی جذبات کا فقدان نہیں ہوسکتا۔ انسان کی فطرت ہی تو ہے جس نے انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کو کسی نہ کسی مذہب کا پابند بنا رکھا ہے۔ رہ گیا اس بڑی اکثریت کے مقابلہ میں چند افراد کا لامذہب ہونا، تو یہ اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ مذہب انسان کی فطرت نہ ہو۔ جس طرح انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کے مقابلہ میں چند مخنثوں یاراہبوں کا وجود اس بات کی دلیل نہیں کہ خواہشات نفسانی انسان کی فطرت نہیں۔۔۔ کسی چیز کا فطرت انسانی ہونا اور ہے اور کسی فطرت انسانی کا خارجی عوارض وعلل کے تحت مردہ وبے جان ہونا اور ہے۔۔۔

یہ ساری گفتگو سائل کے اس مفروضے کی بنیاد پر ہے کہ روزہ کی فرضیت دوسروں پر اثراندازی کیلیئے ہے۔ حالانکہ روزہ اور اسی طرح دوسری عبادتوں کی فرضیت کا صحیح مقصد خود اپنی ذات کی اصلاح اور ہر لمحہ اپنی عبدیت کے تقاضے، نیز خدا اور بندے کے درمیانی تعلق کے احساس کو بیدار رکھنا ہے۔۔۔ اب اگر اس سے کوئی دوسرا بھی متاثر ہوجائے تو یہ ایک دوسری چیز ہے اسے فرضیت کی علت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کو 'نکتہ بعدالوقوع' کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ روزہ، نیز دوسری عبادتوں کی اس صحیح علت کو سمجھنے کے بعد اب سائل خود سوچے کہ ان عبادتوں سے صرفِ

نظر کرنا اپنے کو کتنی بڑی تباہی کی نذر کرنا ہے۔اسلامی احکامات کی علت اپنی طرف سے فرض کر کے اس پر کسی اعتراض کی بنیاد رکھنا، جیسا کہ سائل نے کیا ہے، انصاف و دیانت کا خون کرنا ہے۔۔۔

سائل کو سوچنا چاہئے کہ روزہ جہاں ضبط نفس کا اعلیٰ کردار پیش کرتا ہے وہیں وہ اپنی بعض خصوصیتوں کے سبب دوسری عبادتوں میں انفرادی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جو خالصاً 'لوجہ اللہ' ہی ہو سکتی ہے۔اسلئے کہ اس میں ریا کا کوئی دخل نہیں۔ریا ان اعمال سے متعلق ہو سکتی ہے جنکا صدور ظاہری اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے لیکن روزہ تو ترکِ عمل کا نام ہے پھر اس میں ریا کا کیا دخل۔لہٰذا اپنے معبود ہی کی رضا و خوشنودی جس کی متاعِ حیات ہے روزہ دار وہی ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور کو عقل و فراست کا دور کہنا اور گذشتہ دور کو جہالت و سفاہت کا دور سمجھنا بتا رہا ہے کہ سائل نے ابھی عقل و فراست ہی کو نہیں سمجھا اور نہ ہی اسکے ذہن میں جہالت و سفاہت ہی کا کوئی مفہوم ہے۔کیا سائل اس بات پر غور کرنے کی زحمت گوارہ کرے گا کہ اس سائنٹفک دور میں جبکہ ہر طرف مشینوں کا تسلط ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جال پھیلا ہوا ہے، کیا کہیں سقراط، بقراط، جالینوس، افلاطون، فیسا غورث، بطلیموس، دیمقراطیس، ارسطو، فارابی، بوعلی سینا، وغیرہ نظر آ رہے ہیں؟ آج کل کی تعلیم گاہیں ایسے افراد کو نکالنے سے کیوں عاجز ہیں؟ اب تو جگہ جگہ ایسے لوگ آنے چاہئیں۔سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اُنکے دور کو عقل و فراست کا دور کہوں، یا آج کے اس دور کو جس میں انہیں کے 'چبائے ہوئے لقموں' پر سب کی تحقیق و تدقیق کی اساس ہے اور انہی کے بنائے ہوئے اصول ساری سائنٹفک ترقیوں کی بنیاد ہیں۔

میں نے اس مقام پر علمائے یونان کے اسماء خاص طور پر اس لئے تحریر کیئے ہیں تا کہ سائنس زدہ حضرات عبرت حاصل کریں کہ ان کے پہلے جس منزل تک پہنچ

چکے ہیں ابھی انھیں وہاں کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔۔۔حکمائے یونان کے علاوہ حکمائے اسلام کی ایک طویل فہرست بھی میری نگاہوں میں ہے جن میں کا ہر ایک اپنے دور میں فہم وفراست کا جبل عظیم تھا۔ جنھوں نے حکمائے یونان کی عقل وفراست کے آگے سر جھکانے کے بجائے نظری وفکری طور پر اُن کے سروں کو اپنے آگے جھکا لیا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ فکر ونظر کی ایک ایسی شاہراہ بنا دی جس پر چل کر ہر انسان چرخِ فہم وفراست کے ستاروں کا مرکز نگاہ بن جاتا ہے۔ کیا سائل کوئی ایسی لکیر کھینچ سکتا ہے جو یہ ظاہر کرے کہ اس سے پہلے والے جہالت وسفاہت کے ہیں، اور اس کے بعد والے، عقل و فراست کے۔۔۔ اگر سائل ایسا خط امتیاز کھینچنے سے عاجز ہے تو اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ فہم وفراست کو کسی دور کے ساتھ خاص کرے۔۔۔ ارتقاء انسانی کے فلسفے سے جو با خبر ہیں ان پر یہ حقیقت واضح ہے کہ انسان کی بتدریج ساری ترقیاں فہم وفراست ہی کی مرہون منت ہیں۔ جس دور میں جس فہم وفراست کی ضرورت تھی، قدرت کاملہ کی منت قدیمہ اس دور کے انسانوں کو اس سے نوازتی رہی اور وہی فہم وفراست انسانی فلسفہ ءارتقاء کی ایک کڑی بن گئی۔۔۔ سائل کی یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ:

'اسکے جواب میں اولیاء اور صوفیاء کی مثالیں نہ دی جائیں'

۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائل کو اس بات کا پورا اعتراف ہے کہ انسانی افراد میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں اولیاء وصوفیاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جن کی پوری زندگی کے ہر ہر گوشے پر اخلاقی قدروں اور مذہبی جذبات کا ایسا تسلط ہے کہ وہ کڑی سے کڑی منزل میں بھی احکاماتِ اسلامیہ کی ادائیگی میں کچھ بھی دشواری محسوس نہیں کرتے۔ در حقیقت یہی لوگ اسلام کے سچے وفادار ہیں لہٰذا اگر ان کو صفحات تاریخ سے نکال دیا جائے، تو پھر اسلام میں دنیا کے آگے پیش کرنے کیلئے کون سی چیز رہ جاتی ہے۔ ہر اصول کی صداقت اسکے سچے وفاداروں کی کامیابی سے پہچانی جاتی ہے۔ لہٰذا اسلام کو

سمجھانے کیلئے اگر اسکے سچے وفاداروں لی مثال نہ دی جائے تو پھر کس کی مثال دی جائے؟۔۔۔نیز۔۔۔اسی جملہ سے سائل کے اس اعتراف کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ مقدس ہستیاں اس دور میں بھی ہیں اور ہر دور میں رہی ہیں۔ان کا وجود قرون اولیٰ کے مخصوصات سے نہیں، ورنہ سائل یوں کہتا کہ:

'اس کے جواب میں صحابہ وتابعین کی مثالیں نہ دی جائیں'

۔۔۔سائل نے اسلیئے بھی کہا کہ وہ اس تاریخی حقیقت سے باخبر ہے کہ صحابہ وتابعین سے اگر صرفِ نظر کرلیا جائے جب بھی انکے بعد کے ہر ہر دور میں، حتیٰ کہ اس موجودہ دور میں بھی ایسے کثیر افراد کو سامنے لایا جاسکتا ہے جو خود سائل کی نگاہ میں عظیم کردار کے مالک ہیں۔جن کے نزدیک احکاماتِ اسلامیہ پر عمل ایک آسان ترین چیز ہے۔ ۔۔۔ایسے افراد کا وجود کیا اس حقیقت کو واضح نہیں کرتا کہ احکاماتِ اسلامیہ کی بجا آوری میں سائل کو جو دشواری معلوم ہورہی ہے، وہ محض خیالی ہے۔حقیقت سے اس کو دور کا لگاؤ نہیں۔ورنہ کیسے ممکن تھا کہ شاہراہ اسلام پر یہ نفوسِ قدسیہ ہنستے مسکراتے گذرتے چلے جائیں اور کہیں ایک ٹھوکر کا بھی احساس نہ ہو۔۔۔

ان افرادِانسانی کا وجود یہ بھی بتارہا ہے کہ ابھی مذہبی جذبات کے زمانے کا فقدان نہیں ہوا۔سائل نے یہ نہیں غور کیا کہ جسے وہ صوفی یا ولی کہہ رہا ہے، وہ انسانوں کے سوا کوئی دوسری مخلوق نہیں۔وہ بھی انسان ہی ہیں اور جملہ خواہشات انسانیہ کے حامل ہیں لیکن انھوں نے پرخلوص ایمان کے ساتھ احکامات اسلامیہ پر عمل کو اپنی زندگی کا جزو بنالیا اور زندگی کے جملہ ہنگامہائے شوق اور کائنات کی گہما گہمی میں اپنے کو الجھا کر بھی اپنے خدا سے غافل نہ رہے۔۔۔الحاصل۔۔۔دنیا میں رہے لیکن دنیا کے نہ رہے ۔۔۔لہٰذا۔۔۔ایمان وعمل کے پرخلوص امتزاج کا جو لازمی ثمرہ تھا اس سے ان کا دامنِ مراد کبھی خالی نہ رہا۔۔۔غور فرمایئے آج ایک انسان، تہی دامن انسان، عام انسانوں

جیسا انسان، بلکہ کفر وشرک میں آلودہ انسان، ضلالتوں، گمراہیوں میں گھرا ہوا انسان اگر تائب ہوکر اسلام کا سچا وفادار بن جاتا ہے اور پورے خلوص کے ساتھ اسکے جملہ فرامین ایمانیہ اور احکاماتِ عملیہ کو اپنی زندگی کا 'جزولاینفک' بنالیتا ہے اور دنیا اسے صوفی، ولی، مومن کامل جیسے الفاظ سے یاد کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے، تو پھر دوسرے انسانوں کیلئے فوز و کامرانی کے اس مقدس دروازے کو بند کردینے کی کوشش کرنا، کیا معنیٰ رکھتا ہے۔۔۔

اسلام کی جملہ تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے پیدا کرنے والے کا سچا وفادار، بہ لفظ مختصر، مومن کامل ہو جائے اور ایمان کا کمال اعمال سے روگردانی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں چاہئے تو یہ تھا کہ، انسان اسلام کی مکمل دعوت کو اپنا کر اپنے ہر کردار کو اس کی ہدایت کے مطابق بنالے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ سرکش انسان اسلام کو اپنے کردار کے مطابق بنانا چاہتا ہے اور اپنی بے عملی اور زبوں کرداری کا جواز تلاش کر رہا ہے اور وہ بھی بار بار اور مسلسل اس تجربہ کے بعد کہ اسلام کی بتائی ہوئی شاہراہ پر جو چلا وہ یقینی طور پر کامیاب ہوا اور ہو رہا ہے۔ تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے جس میں اسلام کی سچی وفاداری کسی انسان کے حقیقی خسارے اور گھاٹے کا سبب بن گئی ہو۔ آج مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ دین اسلام کو مانتے ہیں بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ اسلام کو اپنا کر بھی اس کے سچے وفادار اپنے کو بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی سہل پسندی کی زبانِ حال کہتی ہوئی نظر آتی ہے کہ وہ اسلام کے ایسے قانون نکال دینے کی آرزو رکھتے ہیں جو ان سے ایثار و قربانی اور ریاضت و مجاہدہ چاہتے ہیں۔۔۔ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

غور فرمایئے ، وہ کون سا دستور ہے اور وہ کون سا ضابطہ ہے جو اپنے ماننے والوں کی وفاداری نہ چاہتا ہو، تو پھر اگر اسلام اپنے ماننے والوں سے وفاداری کا مطالبہ کرر ہا ہے تو کون سا غیر فطری مطالبہ ہے۔ سچا وفادار ہوئے بغیر کسی دستور کے لازمی ثمرات کی توقع رکھنی کس قدر مہمل اور بے جان سی بات ہے۔

اگر اس قسم کے سوالات کو نگاہ استحسان سے دیکھا گیا تو کیا عجب ہے کہ ایک چور سوال کر دے کہ آج ہر طرف مفلوک الحالی کا دور دورہ ہے، انسانوں کی ایک کثیر جماعت غربت کا شکار نظر آرہی ہے، ایسی حالت میں غریبوں کیلئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ چوری کریں۔ لہٰذا اگر کسی دین میں چوری کو برا کہا گیا ہے اور بڑی شد و مد سے اس کی ممانعت کی گئی ہے، نیز چوری کیلئے حد مقرر کر دی گئی ہے تو وہ دین موجودہ دور کے مطابق نہیں اور اس دور میں چوروں کیلئے ادنیٰ سزا بھی، چہ جائیکہ 'قطع ید'، ایک بے معنیٰ سا قانون ہے، جس کو تسلیم کرنا دشوار ترین امر ہے۔ ایسے اصول کو وہی مان سکتے ہیں جو دولت مند اور خوش حال ہیں۔ بے چارہ وہ غریب کیسے مان سکتا ہے جس کے آگے پیچھے کوئی سہارا نہیں۔ گذارش ہے کہ اسکے جواب میں ان لوگوں کی مثالیں نہ دی جائیں جو غریب رہ کر بھی دیانتدار اور ظالمانہ تصرف سے دور ہیں ۔۔۔یا۔۔۔ کوئی شرابی کہہ اٹھے ۔۔۔ یہ دور غم والم اور رنج ومحن کا دور ہے، بالخصوص غریب مزدور طبقہ نہ جانے کتنے غم وآلام کا شکار ہے، اور شراب غم غلط کرنے کا ایک اچھا اور کامیاب ذریعہ ہے۔ لہٰذا اس دور میں شراب حرام کرنے کا قانون ایک بے معنیٰ قانون ہے جس کا موجودہ دور کے غم کے ماروں کو تسلیم کر لینا ناممکن ہے۔ اس قانون کو وہی مان سکتے ہیں جن کے سر پر کوئی غم ہی نہ ہو۔ گزارش ہے کہ اس کے جواب میں ان لوگوں کی مثالیں نہ دی جائیں جو میدانِ تسلیم ورضا کے ایسے شہسوار ہیں کہ غم وآلام میں بھی مسکراتے ہیں ۔۔۔یا۔۔۔ کوئی بدکردار بول پڑے ۔۔۔ اس غربت وافلاس کے دور

میں جبکہ ایک روٹی کا ٹکڑا حاصل کرنے میں نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، بیچارے غریب مفلس انسان میں اتنی سکت کہاں ہے کہ وہ اپنی شادی کر کے خانہ آبادی کر سکے اور ایک دوسرے نفر کا ذمہ بھی اپنے سر لے لے۔ دوسری طرف خواہشاتِ نفسانیہ بھی اس کے دامن کو نہیں چھوڑ رہی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ دین کیسے مان لینے کے لائق ہو سکتا ہے، جہاں تکمیل خواہشات کے بہیمانہ طرز عمل کے خلاف بڑی بڑی حدیں مقرر ہوں۔ گزارش ہے کہ اسکے جواب میں ان لوگوں کی مثالیں نہ پیش کی جائیں جو اپنے کو مقام انسانیت سے گرانے کو تیار نہیں اور دل میں خدا کا خوف رکھتے ہیں۔۔۔وغیرہ۔۔۔وغیرہ۔

غور فرمایئے! یہ سوالات ہیں یا اخلاقی قدروں کے جنازے؟ ان سوالات کے پردے سے جو ذہنیت جھانک رہی ہے وہ انسان کو کہاں لے جانا چاہتی ہے؟ انسانیت دشمنی کی اس سے بدترین صورت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایسی فضا ہموار کی جائے جس میں انسان بہیمانہ طرز زندگی کو اپنا کر بھی اپنے کو انسان سمجھے۔۔۔ کچھ اسی سے ملتا جلتا رنگ ہے، سائل کے سوال کا، جہاں اخلاقی قدروں کے فقدان کیلئے قانون و اصول کی اختراع کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ ان تمام سوالات کو دوبارہ غور سے ملاحظہ فرمایئے۔ ہر سوال کا آخری جملہ جسکا آغاز 'گزارش ہے' سے کیا گیا ہے، اپنے اجمال میں اس سوال کا مکمل جواب لئے ہوئے ہے۔ ان سوالوں کے ان آخری جملوں میں جن کا استثناء کیا گیا ہے، کیا ان کا وجود اس بات کی دلیل نہیں کہ سائل جن امور کو اپنی قلبی کجی کے سبب ناممکن العمل سمجھ رہا ہے، درحقیقت ان پر عمل دشوار نہیں اور سائل کے یہ سوالات معقولیت کے بجائے نفسانیت پر مبنی ہیں۔

غور فرمایئے! اگر ساری دنیا سے دیانتداروں، تسلیم و رضا کے شہسواروں اور خدا سے ڈرنے والوں کو الگ کر دیا جائے تو پھر عالمِ انسانیت میں انسان نما درندوں

اور ان کی درندگی کے سوا کیا رہ جائے گا۔تو بھلا بتایئے ، انسانیت کو سمجھانے کیلئے اگر انسانوں کی مثالیں نہ دی جائیں تو کیا درندوں اور دو ٹانگ کے جانوروں کی مثالیں پیش کی جائیں۔۔۔ان تفصیلات کو سامنے رکھنے کے بعد اس جواب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، جو علماء نے دیا ہے کہ:

'اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے 'صائم بالنہار' اور 'قائم باللیل' رہ کر بڑی بڑی لڑائیوں میں فتوحات حاصل کی ہیں۔اسلیئے اس دور میں بھی محنت وجانفشانی کو ترکِ صوم کیلیئے ایک بہانہ بنانا ایک غلط بات ہے۔'

میں نے یہ جواب سائل ہی کے پیش کردہ سوال سے ذرا سی لفظی و معنوی ترمیم کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔اسلیئے کہ سائل کے الفاظ علماء کے ان جوابی خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے جو خود سائل ان کی طرف سے پیش کرنا چاہتا ہے۔۔۔اس مبلغ علم و ادب پر اسلام کے اصولوں پر اعتراض کرنے کا حوصلہ بھی عجب العجائب سے کم نہیں۔

۔۔۔اچھا اب آیئے سائل کا چوتھا سوال ملاحظہ فرمایئے:

'زکوٰۃ صاحب نصاب پر فرض ہے یعنی ہر متمول کو یہ حق دیا گیا ہے کہ محتاجوں پر اپنی خیر وخیرات سے اثر جمائیں، ہوسکتا ہے اسلامی اسپرٹ تمول کی مساوی تقسیم پر منتج ہو جیسا کہ خلفائے راشدین کے دور میں رہا ہے۔ اس میں سب سے اہم چیز بیت المال کا قیام ہے جس میں دینے اور لینے والے پر ایک حجاب باقی رہتا ہے۔اور یہ بڑی حد تک کمیونزم کے نظریہ سے مطابقت رکھتا ہے لیکن علمائے کرام نے انفرادی زکوٰۃ کے جواز سے اس اسلامی اسپرٹ کا خاتمہ کر دیا اور ہر صاحب نصاب یہ توقع رکھتا ہے کہ اس سے زکوٰۃ حاصل کرنے والے افراد اور ادارے اس کے مرہونِ منت رہیں۔کیا اس طرح زکوٰۃ تمول پرستی کا سبق نہیں دیتی؟'

یہ حقیقت ایک ادنیٰ فہم وفراست کے انسان پر بخوبی واضح ہے کہ قانونِ

زکوٰۃ ہی 'کل اسلام' نہیں، بلکہ اسلام کے جملہ قوانین میں اسے صرف ایک قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صرف ایک قانون کو تسلیم کر لینا، یہ اسلام کا مان لینا نہیں ہوا۔ اسلام کی سچی وفاداری کیلئے ضروری ہے کہ اسکے ہر ہر قانون پر پورے خلوص کے ساتھ 'آمَنَّا وَصَدَّقنَا' کہا جائے۔ اور ان کو اپنی عملی زندگی کا 'جزو لاینفک' بنالیا جائے۔ اب آیئے اسلام کے ایک خاص پہلو کو سمجھنے کیلئے قرآنِ کریم کی صرف دو آیتیں ملاحظہ فرمایئے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ﴿١٨﴾ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ ﴿١٩﴾ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ﴿٢١﴾

﴿سورۃ الیل: ۱۷۔۲۱﴾

اور جلد ہی دور رکھا جائے گا اس سے سب سے بڑا التقویٰ والا جو دیتا ہے اپنا مال
کہ خود پاکیزہ ہو جائے اور نہیں ہے کسی کا اسکے پاس کوئی احسان کہ بدلہ دیا جائے،
مگر اپنے بلند و بالا رب کی مرضی کو چاہنا، اور یقیناً عنقریب وہ خوش ہو جائے گا۔

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٦٢﴾

﴿سورۃ البقرۃ: ۲۶۲﴾

جو خرچ کریں اپنے مال کو اللہ کی راہ میں، پھر نہ پیچھا کریں اسکا جو خرچ کیا احسان جتا کر اور نہ دکھ دے کر، تو ان کیلئے اجر ہے انکے رب کے پاس، اور نہ ان پر کوئی خوف اور نہ رنجیدہ ہوں۔

معلوم ہوا مسلمان زکوٰۃ دیتا ہے، خواہ کسی ایک فرد کو یا ادارے کو یا بیت المال کو، اسکا منشا، نہ احسان جتانا ہے اور نہ اثر جمانا، بلکہ اسکا اپنے اس عمل سے صرف اپنے رب کی رضا مقصود ہے۔ اسلئے خیر و خیرات میں ایسے اخفاء کہ دائیں سے دیں تو بائیں کو خبر نہ ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے محبوب ترین عمل ہے۔ زکوٰۃ دیتے وقت بھی صرف دل میں نیت کافی ہے۔ زبان سے اظہار نہ کرنا چاہئے، تاکہ لینے والے کو طبعاً سبکی یا

پشیمانی نہ محسوس ہواور اگر بالفرض رضائے الٰہی کے سوا زکوٰۃ دینے سے کوئی اپنا اور مقصود بنالے تو اسکا الزام قانونِ زکوٰۃ پر نہیں ، بلکہ خود اس فرد کے اوپر ہے جو اسلامی اسپرٹ کے فقدان کے سبب اسلامی تعلیم کے خلاف قدم اٹھا رہا ہے۔زکوٰۃ فرض فرمانے والے اسلام نے ، کیا احسان جتانے والوں کی زبانوں پر قفل نہیں چڑھادیا؟ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کسی دستور کی ایک دفعہ پر اسکی دوسری دفعات سے صرف نظر کر کے اعتراض کیا جائے۔

اس مختصر جواب سے سائل پر روشن ہو گیا ہوگا کہ اس کا سوال اسلامی قوانین سے نہ واقفیت اور اسلامی اسپرٹ سے بے خبری پر مبنی ہے۔جس اسلام نے سارے انسانوں کے' تفوق و تعلّی '، ' ترفع و کبریائی' کے دروازے کو بند کر کے صرف خدا کی کبریائی کے آگے سب کو جھکا دینے کو اپنے پورے اخلاقی جواہر پاروں کا مقصودِ نظر بتایا ہو،اس پر یہ بہتان کتنا عظیم بہتان ہے کہ وہ لوگوں سے دوسرے لوگوں کی کبریائی تسلیم کرانا چاہتا ہے۔کیا سائل کو یہ خبر نہیں ہے کہ کسی دستور کے ماننے والوں کی بے راہ روی اور ہے ، اور کسی دستور کی بے راہ روی اور۔دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔کسی فرد کی اپنی غلطی کو اسکے دین کے سر تھوپنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی چور،شرابی، بدکار، کمیونسٹ کو دیکھ کر کمیونزم کو چوری ،شراب خوری، زبوں کرداری ، بدکاری ، سکھانے والا ازم کہہ دیا جائے ۔۔۔ جب آپ اسلام پر اعتراض کرنے چلیں ہیں تو اسلام کا گہرا مطالعہ کیجئے۔ اس کے قوانین کو سامنے لایئے اور پھر تاب سخن ہوتو کچھ عرض کیجئے۔ مسلمانوں اور وہ بھی موجودہ دور کے مسلمانوں کے احوال دیکھ کر اسلام پر اعتراض کیا معنیٰ رکھتا ہے۔آپ مسلمان کو اسلام کا پابند سمجھتے ہیں یا اسلام کو مسلمان کا؟۔۔۔اسلام کو سمجھنے کیلئے صحیح ترین صورت یہ ہے کہ قرآن وحدیث کا گہرا مطالعہ کیا جائے ۔۔۔یا۔۔۔ ان ہستیوں کے لیل ونہار کا جائزہ لیا جائے جنکی زندگی کا ہر لمحہ اسلام کی سچی وفاداری

میں گذرا۔۔۔سائل نے غور نہیں کیا کہ اسلام نے غریبوں کے حقوق کو سرمایا داروں کے سر پر مسلط کر کے جہاں غربا پروری کو ایک لازمی امر اور اسلامیت کا مقتضاء قرار دیا ہے، وہیں زکوٰۃ دینے والوں کے قلوب کو ایک بہت بڑے مرض یعنی بخل سے نجات دیکر مجلیٰ و مصفیٰ کر دیا ہے۔۔۔نیز۔۔۔دنیا کو اس فلسفہ سے آگاہ کر دیا کہ دولت کی حرکت میں جو برکت ہے وہ اس کے جمود و تعطل میں نہیں۔

رہ گیا سائل کا یہ گمان کہ 'قانون زکوٰۃ سے اسلام دولت کی مساوی تقسیم چاہتا ہے'، اسلامی فقہ کو نا سمجھنے پر مبنی ہے۔اسلئے کہ دولت کی مساوی تقسیم کیلئے ہر دور میں بیت المال کا قیام لازمی ہے اور یہ بھی لازمی کہ اپنی دولت کے صرف چالیسویں حصہ کا نہیں بلکہ پورے دولت کا اسٹیٹ کو مالک بنا کر اسے بیت المال کے سپرد کر دیں اور وہ اسٹیٹ اپنے اندر بسنے والوں کا اعداد و شمار کر کے جتنی دولت مناسب سمجھے، سب میں برابر تقسیم کر دے اور یہ نہ دیکھے کے راعی کون ہے اور رعایا کون۔سپہ سالار کون ہے، سپاہی کون۔ایک معمولی ٹیچر کون ہے اور ایک لائق پرفیسر کون۔مزدور کون ہے، معمار کون، وغیرہ وغیرہ۔۔۔الحاصل۔۔۔سب دھان بائیس۲۲ پنسیری بلفظ دیگر، 'اندھیر نگری چوپٹ راجہ، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا'۔۔۔انسانی خمیر میں صلاحیت واستعداد کی جو فطری تفریق ہے، اس کا کوئی لحاظ نہ ہو۔بس اسٹیٹ 'مختار مطلق' ہو اور اسٹیٹ کے بیت المال کو بھرنے والے 'مجبور محض'۔۔۔دیکھا آپ نے دولت کی یہ اشتراکی مساویانہ تقسیم کس قدر غیر فطری قانون کی تشکیل چاہتی ہے۔

اسلام جو دین فطرت ہے بھلا اس کا کوئی قانون ایسا ہوسکتا ہے جو انسان کی فطرت کے خلاف ہو؟ اس لئے اسلام نے عثمانِ غنی اور دوسرے متمول صحابہ کی دولت چھین کر غریب و مفلس صحابہ کرام پر تقسیم نہیں کر دی بلکہ دونوں میں ایک ایسی اسپرٹ پیدا کر دی کہ غریب دوسرے کے غنا سے بے نیاز ہو کر، اپنی غربت کو 'صبر و توکل' کی

چادر میں لپیٹے اپنے کو کامیاب سمجھ رہا ہے اور بالکل مطمئن ہے۔ اور دولت مند اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں لٹانے کیلئے ہر وقت تیار و مستعد نظر آ رہا ہے۔ اور وقت آنے پر اپنا سب کچھ لٹا کر اپنے اندر سکون واطمینان کی فراوانی کا احساس کرتا ہے۔۔۔ یہ ہے اسلام کا فطرت کے مطابق قانون کے ساتھ ذہنی انقلاب، جو دولت مندوں کو مٹا کر غریب نہیں بناتا بلکہ غریبوں کو دولت مندوں کا بھائی بنا کر گلے ملا دیتا ہے۔ کوئی انصاف سے بتائے، اِس ملانے میں جو خوبی ہے وہ اُس مٹانے میں کبھی آ سکتی ہے؟ یہاں یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام کا 'فلسفۂ زکوٰۃ' کمیونزم کے 'نظریۂ مساوات' کے لکل غیر مطابق ہے۔۔۔

دورِ خلافت راشدہ میں بیت المال کے قیام نے سائل کو دھوکے میں ڈال دیا۔ لیکن کم از کم اُسے یہ تو سوچنا چاہئے کہ اسلام کو کامل و مکمل صورت میں پیش فرمانے والے حضور آیۂ رحمت ﷺ کے دور میں بیت المال کا کوئی وجود نہیں تھا۔۔۔ معتبر روایات کی بنیاد پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے عہد خلافت میں بیت المال کے نام سے کوئی خزانہ نہیں قائم فرمایا۔۔۔ ہاں ایک روایت کے مطابق عہد خلافت صدیقی میں بیت المال کا قیام عمل میں آ چکا تھا، لیکن اس کا کوئی نظام مرتب نہ ہو سکا تھا، اسلئے کہ انکے زمانہ میں جب کبھی مال غنیمت آیا، تو مختصر ہونے کی وجہ سے، فوراً لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، لہٰذا اسکے جمع کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئی۔ کم وبیش یہی طریقہ فخر دوعالم ﷺ کی حیاتِ مبارک میں بھی رائج تھا۔

البتہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے، جو عامل بحرین تھے، پانچ لاکھ کی رقم کثیر حضرت امیر المومنین کی خدمت میں پیش کی۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ کے اجلاسِ عالم کو طلب فرما کر مرضی معلوم کرنی چاہی، کہ اس خطیر رقم کو دستور سابق کے

طور پر تقسیم کر دیا جائے یا خزانے کی مستقل شکل دی جائے؟۔۔۔صحابہء کرام رضی اللہ عنہم اس مسئلہ میں مختلف الخیال تھے لیکن ولید بن ہشام نے یہ بات کہی کہ، 'سلاطین شام کے یہاں 'خزانہ' اور 'دفتر' کا الگ الگ محکمہ قائم ہے'۔اس بات کو حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے بے حد پسند فرمایا۔ چنانچہ سب سے پہلے مدینہ منورہ میں ایک بہت بڑا خزانہ قائم کیا گیا اور اسکی نگرانی کیلئے حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ، جو معزز تعلیم یافتہ صحابی ہونے کے علاوہ دیانت داری میں بھی 'شرطِ تامہ' رکھتے تھے، کو بحیثیت افسر اعلیٰ معمور کیا اور انکے ماتحت کچھ لوگ مزید بھی رکھے گئے۔ مدینہ منورہ کے علاوہ تمام صوبوں اور صدر مقامات میں بھی بیت المال قائم کئے گئے جو علیحدہ محکمہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس تاریخی تراشے نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ادائیگیٔ زکوٰۃ کیلئے بیت المال کا حجاب اپنانے کو، اسلامی اسپرٹ کا مقتضا سمجھنا، خود اسلامی اسپرٹ کے مفہوم و معنیٰ کے نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔ اگر ادائیگیء زکوٰۃ کیلئے حجاب بیت المال کا فقدان اسلامی اسپرٹ کے فقدان کے مترادف ہوتا تو عہد رسالت میں اس کا وجود ناگزیر تھا۔مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ عہد رسالت تو بڑی بات، عہد صدیقی میں بھی اس کا کوئی باضابطہ وجود نہ ہو سکا۔ مزید براں عہد فاروقی میں اس کے قیام کا مسئلہ سامنے آیا تو بہت سے صحابہء کرام نے اس سے اختلاف بھی کیا۔ تو کیا عہد رسالت و دورِ صدیقی نیز دورِ فاروقی میں اختلاف کرنے والے صحابہ، ان سب کو اسلامی اسپرٹ سے خالی قرار دے دیا جائے گا؟

معلوم ہوا کہ بیت المال کا قیام سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا جس کو اپنالینا گو لازمی و ضروری نہ تھا، لیکن دورِ فاروقی کے تقاضے کے مطابق تھا۔۔۔نیز۔۔۔ شریعت اسلامیہ کے بھی کسی قانون سے متصادم نہ تھا، اسلئے اپنا لیا گیا۔۔۔اس مسئلہ میں بعض صحابہ کا اختلاف اس بنیاد پر تھا کہ جو چیز عہد رسالت و دورِ صدیقی سے چلی

آ رہی ہے، اسکو یونہی برقرار رکھنا چاہیئے۔ اس تراشے نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ بیت المال کا قیام اموالِ غنیمت کو جمع کرنے کیلئے عمل میں لایا گیا تھا۔ ایسا نہیں کہ زکوٰۃ لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کی جائے اور پھر مساکین پر اس کی تقسیم کرادی جائے۔ اسلئے کہ اس کام کیلئے بیت المال کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ تو لوگ انفرادی طور پر کر ہی رہے تھے۔ اور اس پر ہر دور میں اتنا پابند تھے کہ جب بعض لوگوں نے عہدِ صدیقی میں زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو ان سے قتال تک کی نوبت آ گئی۔

مذکورہ بالا اس تحریر سے ظاہر ہو گیا کہ سائل کا یہ الزام غلط ہے کہ 'انفرادی طور پر زکوٰۃ دینے کا جواز علمائے کرام نے نکالا ہے'۔ غور فرمائیے کہ عہدِ رسالت میں جبکہ بیت المال کا کوئی تصور نہیں تھا، وہاں زکوٰۃ نکالنے کی کیا صورت تھی۔ ظاہر ہے کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا گیا اور وہ اسی حکم کے مطابق زکوٰۃ نکالتے رہے۔ تو کیا اس دور میں یہ سب کچھ علماء نے کیا تھا؟۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائل کا تاریخی مطالعہ بھی نہایت ناقص ہے۔۔۔

زکوٰۃ دینے اور لینے والے کے درمیان سائل جس حجاب کی ضرورت محسوس کر رہا ہے، وہ حجاب عذاب بھی بن سکتا ہے۔ خصوصاً اس دور میں جبکہ، خود سائل کے نزدیک، موجودہ انسان اس قدر پستی میں آ گیا ہے جہاں نفسانیت کا اس پر تسلط ہے، غلبہ و اقتدار کی ہوس کا شکار ہے، دیانت و امانت جیسے الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں، ایسی صورت میں یہ حجاب عذاب یوں بنے گا کہ نہ تو دینے والے کو پتہ چلے گا کہ میری بیت المال میں جمع کردہ رقم کہاں گئی اور نہ مستحقین کو معلوم ہو سکے گا کہ کس نے لیا اور کیا لیا اور بیت المال کی ساری پونجی یا اچھی خاصی پونجی امین وخازن اور ان کے اعوان و انصار کے مخصوص بیت المال تک پہنچ جائے گی۔ یہ توقع ظن غالب اور ظن غالب آگے بڑھ کر یقین کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کے بیت

المالوں پر ان اشتراکیوں یا اشتراکی جیسوں کا تسلط ہے، جنکے نزدیک خوفِ خدا تو بڑی چیز، وجودِ خدا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا، نیز جنکے مذہب میں آخرت اور مواخذہ کی کوئی حیثیت نہیں۔۔۔جن کو اگر کچھ خوف ہے تو صرف محاسبہء انسانی کا خوف ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسانی محاسبہ کی زد سے اپنے کو بچائے رکھنا تو انسانوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، بالخصوص ایسے پر آشوب دور میں جبکہ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوں، ایسے ماحول میں اس محاسبہ کا بھی کیا سوال رہ جاتا ہے۔ بیت المال کے قیام سے پہلے ان اصولوں کو اپنا لیجئے جو ایک انسان کو عبداللہ بن ارقم بنا دیتے ہیں اور وہ ہیں اسلامی اصول۔ ان اصولوں کو جب آپ اپنا لیجئے گا تو پھر عبداللہ بن ارقم جیسوں کے نقش قدم پر سر رکھ کر چلنے کا سلیقہ آجائے گا۔۔۔

سائل نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ جب اسکے نزدیک ہر صاحب نصاب توقع رکھتا ہے کہ اس سے زکوٰۃ حاصل کرنے والے افراد اور ادارے اسکے مرہونِ منت رہیں تو پھر اس توقع سے کون سی چیز روک سکتی ہے کہ خود بیت المال اسکا مرہونِ منت ہو یا کم از کم وہ مساکین رہین احسان ہوں جنھیں بیت المال سے روپیہ مل رہا ہو۔ اسلئے کہ مستحقین کو جو رقم مل رہی ہے وہ انھیں اصحابِ نصاب ہی کی تو عطا کردہ ہے۔۔۔ خود سائل ہی نے اس بات کی تصریح کردی ہے کہ اصحابِ نصاب کی احسان مندی کی توقع صرف افراد ہی سے نہیں بلکہ اداروں سے بھی متعلق ہوتی ہے۔۔۔اور بیت المال بھی ایک ادارہ ہی ہے۔ جس طرح دوسرے ادارے، دینے والے اور مستحقین کے درمیان، صرف واسطہ ووسیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں، وہی حال بیت المال کا ہے، تو پھر جو توقع عام اداروں سے وابستہ کی جاسکتی ہے وہی بیت المالوں سے بھی وابستہ کی جاسکتی ہے۔۔۔الحاصل۔۔۔بہ گمانِ سائل جس نفسانی کجی کی درستگی کیلئے یہ نظام قائم کیا گیا ہے، اسکا امکان تو اس کے قیام کے بعد بھی بدستور اپنی جگہ پر ہے، گو صورت بدلی

ہوئی ہے۔۔۔ان جملہ تحقیقات کو پیش نظر رکھ کر اب سائل خود ہی فیصلہ کرلے کہ زکوٰۃ تزکیہ قلوب اور غربا پروری کا سبق دیتی ہے یا سرمایا پرستی کا؟۔۔۔

۔۔۔آیئے اب سائل کا آخری سوال ملاحظہ فرمایئے:

'حج صاحب استطاعت پر فرض ہے۔صرف متمول ہی حج کر سکتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حج دنیا کے سارے مسلمانوں کے اجتمائی مسائل حل کرنے کیلیئے بطورِ عبادت فرض قرار دیا گیا ہے، اور علماء یہ کہتے بھی ہیں، لیکن آج تک حج نے کسی بین الاقوامی مسئلہ کو حل نہیں کیا۔اس کی مثالیں کئی دی جاسکتی ہیں۔مثلاً: روسی مسلمانوں کے مسائل اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل۔اس طرح آج کل حج، متمول لوگوں کیلیئے ایک تفریح سے زیادہ کچھ نہیں ہے، بلکہ موجودہ سعودی عرب کی ترقی نے تو اس قدر ریاکاری پیدا کردی ہے کہ حج ایک تجارت بن گیا ہے۔اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ متمول کو متمول تر بنایا جائے'۔۔۔

سائل کے اس سوال کی بنیاد اس مفروضے کو تسلیم کرلینے پر ہے کہ'حج دنیا کے سارے مسلمانوں کے اجتمائی مسائل حل کرنے کیلیئے بطورِ عبادت قرار دیا گیا ہے'۔ اب اگر یہ ثابت کردیا جائے کہ سائل کا یہ مفروضہ بے بنیاد و غیر صحیح ہے تو سائل کے سوال کی ساری عمارت زمین پر آرہی ہے۔۔۔درحقیقت فریضۂ حج، سالانہ اس اسلامی وحدت کا ایک عالمی مظاہرہ پیش کرتا ہے جس میں قوم و وطن، رنگ و نسل، اور زبان و بیان کی تفریق کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔۔۔رومی ہوں کہ حبشی، ہندی ہوں کہ چینی، روسی ہوں کہ امریکی۔۔۔الغرض۔۔۔عربی ہوں کہ عجمی، حرم کی مقدس سرزمین پر سب کے کردار، گفتار اور رفتار کی یکسانیت و وحدت بتا رہی ہے کہ مسلمان مختلف قوموں کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ خود ایک قوم کا نام ہے۔جب تک رنگ و نسل اور زبان و بیان کی

بنیاد پر قوموں کی تشکیل کی جائے گی اس وقت تک انسانوں کے درمیان ایک عالمی انتشار وافتراق ناگزیر ہے۔۔۔قربان جایئے اسلام پر! جس نے قوموں کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک لڑی میں پروکر ان کو صرف ایک قوم کی صورت دیدی، جس کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ رنگ ونسل اور زبان وبیان کی بنیاد پر قوموں کی تفریق، یہ خود انسانوں ہی کی اپنی خودساختہ تفریق ہے۔ 'الٰہی قانون' سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔۔۔اس تفریق سے انسانوں کے خود اپنے اغراض ومقاصد متعلق ہیں۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام اپنے اس دعویٰ میں سچا نہیں۔ تاریخ کے اوارق اس دعویٰ کی صداقت کے اظہار کیلئے کافی ہیں۔ جا بجا اسلامی کانفرنسوں کا ہونا کوئی نئی بات نہیں، جن میں 'وحدتِ اسلامی' کے عنوان سے دھواں دھار تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اسٹیج پر اتنا موقع کہاں میسر آسکتا ہے کہ گفتار کو کردار کے روپ میں پیش کیا جا سکے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ سال میں کم از کم ایک ایسی عالمی کانفرنس ہوتی رہے جس میں 'وحدتِ اسلامی' کو گفتار کے بجائے کردار سے ثابت کیا جائے تاکہ گفتار کے اسٹیج سے ذہن انسانی کو 'وحدتِ اسلامی' کے متعلق جو دعوتِ غور وفکر ملتی ہے کردار کا اسٹیج اس وحدت کا مشاہدہ کراتا رہے۔ اسی کردار کی کانفرنس کی ضرورت فریضۂ حج سے پوری ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حج کے مقدس اور سنہرے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا کے سارے مسلمانوں کے اجتمائی مسائل کے حل کرنے کی بھی اگر کوئی صورت نکالی جائے تو نکل سکتی ہے۔ لیکن اس کو فریضۂ حج کی علت نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک ایسا حسین موقع عطا فرمادیا ہے جس میں 'ادائیگی فریضہ' کے بعد اگر سب لوگ چاہیں تو اپنے گوناگوں اجتمائی مسائل کے حل کی صورت نکال سکتے ہیں۔

یہی مطلب ہے علماء کرام کے ارشاد کا، جس کو سائل نے کچھ الٹا ہی سمجھا۔

اس گفتگو سے یہ حقیقت ظاہر ہوگئی کہ اسلام نے جس تصور کے پیش نظر حج کوفرض قرار دیا ہے، وہ ایک اہم ترین تصور ہے جس کو سیر وتفریح سے کوئی لگاؤ نہیں۔اب اگر کوئی نادان اس کو سیر وتفریح ہی قرار دے تو اسے اس کی نادانی کہا جائے گا۔اس سے اسلام کا دامن کہاں داغ دار ہوتا ہے؟۔۔۔اسی طرح اگر کوئی حج کو ذریعۂ تجارت بنالے تو اس کا الزام اسی فرد کے سر پر رکھا جائے گا۔افراد کی غلطی یا ذہنی کجی اس دستور کی غلطی وکجی نہیں جس دستور کو ماننے کے یہ مدعی ہیں۔اگر اعتراض کرنے کی یہی روش رہی تو دنیا کا کوئی دستور اپنے دامن عصمت کو بچا نہ سکے گا۔اسلئے کہ اسکے ماننے کا ادعا کرنے والے اگر سب کے سب نہیں تو بعض تو ایسے نکل ہی آئیں گے، جو اس دستور کے مخلص وفادار نہیں۔کسی دستور پر اگر تنقید کرنی ہے تو پہلے افراد سے صرفِ نظر کیجئے پھر کہیں جاکر اہل فہم حضرات کے نزدیک آپ کی تنقید کی کچھ وقعت ہوسکے گی۔مگر شرط یہ ہے کہ نقاد،'نقد ونظر' سے پہلے متعصبانہ نقطۂ نظر سے اپنے دامن دل ودماغ کو پاک کرچکا ہو اور اسکی تنقید کا منشأ صرف ایک منزل میں بیٹھ کر، خواہ مخواہ کیلئے دوسری منزل پر صرف پتھر پھینکنا نہ ہو۔موجودہ سعودی حکومت کی ریا کاریاں، مکاریاں، زبوں کرداریاں سب مسلم، لیکن اس سے اسلام کے دامن کو داغ دار سمجھنا یا فریضۂ حج کی ضرورت محسوس نہ کرنا کون سا صحتمندانہ طرزِ فکر ہے۔۔۔نہ تو سعودی حکومت کا نام اسلام ہے اور نہ اسلام کا نام سعودی حکومت۔۔۔یہ تو وقت کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک داغ دار کے دامن کے دھبوں کو دوسرے پاک طینت کے دامن کا داغ قرار دیا جارہا ہے۔اور یہ کوشش نہیں کی جارہی ہے کہ جو اصل مجرم ہے اسکے جرم کی اسے سزا دی جائے یا کم از کم اس کی اصلاح کی صورت نکالی جائے۔

سعودی حکومت کی موجودہ ساری بے عنوانیوں کا الزام اسلام کے سر اسی وقت آسکتا تھا جبکہ وہ خود اس کی تائید کرتا اور فریضۂ حج کو انہی 'ریا کاریوں' کیلئے فرض

قرار دیتا۔ لیکن جب دستورِ اسلام میں ایسی واضح دفعات موجود ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ سعودی حکومت کی سیاہ کاریاں، ہدایت نہیں ضلالت ہیں۔ سلامت روی نہیں، گمراہی ہیں۔ ایمان نہیں، ایمان شکنی ہیں۔ اسلام نہیں، اسلام دشمنی ہیں۔ تو پھر سعودی بے اعتدالیوں کو اسلام کے سر تھوپ کر اسے اسلام کی بے اعتدالی سمجھنا کہاں کی ہوشمندی و اعتدال پسندی ہے؟۔۔۔۔

هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

ایک تعلیم یافتہ خاتون کے تین سوالات

شہر جون پور کی ایک تعلیم یافتہ خاتون نے تین سوالات، شیخ الاسلام، حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی، جیلانی مدظلہ عالی، جانشین حضور محدث اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیئے تھے اور تحریری جواب کی فرمائش کی تھی۔ یوں تو کہنے کیلئے یہ صرف تین سوالات ہیں لیکن حقیقت میں ہر سوال ایک 'جہانِ خیال' کی حیثیت رکھتا ہے اور جماعت اسلامی کے تمام افکار کا ماحصل ہے۔

۔۔۔سوالات:

۱۔۔۔ہم لوگوں کو کس اسلام کی دعوت دیں۔ اُس اسلام کی جو حضور ﷺ لائے تھے اور جو حضور ﷺ کے بعد خلافت راشدہ کے دور تک سرزمین عرب پر جلوہ افروز رہا اور پھر اسکے بعد اب تک محض خواب وخیال ہے یا اس اسلام کی جو آج کل مسلمانوں کی مختلف جماعتوں، ٹولیوں اور گروہوں میں تقسیم ہو گیا؟

۲۔۔۔اسلام کا مزاج چاہتا ہے کہ اسکے ماننے والے اسکی اپنی حکومت قائم کریں۔ کیونکہ غیر اسلامی نظام میں مکمل اسلام پر عمل ہی نہیں ہوسکتا۔۔۔مثلاً: نہ چور کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے اور نہ حدود جاری کی جاسکتی ہیں، نہ سود سے بچایا جاسکتا ہے، نہ جہاد کیا جاسکتا ہے، وغیرہ۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ ۱۳۰۰ سال سے اسلام اپنے رنگ وروپ میں زمین کے کسی حصّہ میں نہ موجود تھا اور نہ اب ہے۔ اس کوتاہی کا ذمہ دار کون ہے یا یہ اسلام ہی کا نقص تو نہیں؟

۳۔۔۔اگر اسلام ایسا ہی خیالی، وہمی اور نا قابل عمل نظام زندگی ہے جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے ختم ہو جانے کے بعد پھر خود صحابہ وتابعین اور تبع تابعین جیسی مقتدر ہستیاں دوبارہ اس نظام کو اس کے اصلی رنگ وروپ میں جاری ونافذ نہ کر سکیں تو پھر ہم ہندوستانی مسلمان خواہ مخواہ کیوں لکیر پیٹتے رہیں اور نقصان اٹھاتے رہیں! ہم کیوں نہ وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لادینی کی راہ اپنالیں؟

تین سوالوں کا جواب

سائل نے بظاہر تین سولات کئے ہیں لیکن ہر سوال کے بطن میں کئی ایک سوال نظر آئے۔ لہٰذا میں نے مناسب خیال کیا کہ جواب سے پہلے ایک ایسی تمہید پیش کر دی جائے جس سے بآسانی تمام سوالات کے جوابات حاصل کئے جاسکیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا یہ جواب سائل کیلئے کہاں تک اطمینان بخش ہوگا۔ لیکن دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو حق سمجھنے اور صداقت کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے!! اپنی علمی کم مائیگی کے اعتراف کے ساتھ فضل الٰہی پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ اگر سائل اس جواب کے کسی حصے سے مطمئن نہ ہوتو وہ اُس کے بارے میں مزید تبادلہء خیال کرسکتا ہے اور اپنے رفع شبہات کیلئے وہ دوسرے سوالوں کو بھی عنوان گفتگو بنا سکتا ہے، بشرطیکہ حقیقت امر کو معلوم کر لینے کے بعد اسے تسلیم کرنے میں وہ کوئی پس وپیش نہ کرے اور ایسا کوئی قدم نہ اُٹھائے جو دیانت واخلاص کے منافی ہو!

اسلام کسی ملکی، شہری، خانگی، بیرونی، مجموعی یا انفرادی نظام زندگی کا نام نہیں بلکہ یہ ان اٹل، بے بدل اور غیر متبدل قوانین الٰہیہ کا نام ہے جسکا امین ومحافظ صحیفہ ربانی یعنی قرآن کریم ہے اور رسول کریم ﷺ کی سنت کریمہ ہے!

ہاں، بلاشبہ یہ قوانین واصول اپنے اندر ایسی جامعیت رکھتے ہیں کہ ملکی و شہری، خانگی و بیرونی، مجموعی وانفرادی اور دنیوی واخروی زندگی کی فلاح وبہبودی کا واحد علاج ہیں اور ہر شعبہء حیات کیلئے تا قیام قیامت منارۂ ہدایت ہیں۔ اسلام کی

زندگی فی الحقیقت انھیں قوانین کی زندگی ہے اور اسکی موت دراصل انھیں اصولوں کی موت ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اسلام اس وقت تک فنا نہیں ہوسکتا جب تک کہ یہ قوانین فنا نہ ہوجائیں۔ لہٰذا ان قوانین کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد اسلام کے وجود کا اقرار کرنا لازمی و ناگزیر ہے۔

بفرض محال اگر صفحہء وجود پر کوئی مسلمان نہ ہو لیکن غیر مسلم کے دل میں یا اس وسیع کائنات کے کسی بھی حصے میں قرآنِ کریم اور رسول اکرم ﷺ کے اقوال وافعال، نیز تقاریر کے جواہر تابناک موجود ہوں تو ایسی مفروضہ صورت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ صفحہء ہستی پر کوئی مسلمان نہیں۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اسلام فنا ہو گیا! اسلئے کہ قوانین کا وجود اور شئے ہے اور ان کا نفاذ دوسری بات ہے۔ 'عدم نفاذ'، 'عدم وجود' کو مستلزم نہیں۔۔۔ حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن مقدس اور سنت کریمہ کی پاکیزہ تعلیمات سے کائنات کا دامن جب تک بالکل خالی نہ ہوجائے، اسلام اور وہی پرانا اسلام، دائم وقائم رہے گا۔

اسلام بنیادی طور پر تمام شعبہ ہائے حیات میں انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت دیتا ہے۔ اسکا مطالبہ یہی ہے کہ ارادوں کی تکمیل کا جو نقشہ مرتب کیا جائے، وہ صراطِ مستقیم سے جداگانہ نہ رہے۔ بس اسی کو اسلام کا مزاج بھی سمجھئے۔

یہ تو ایک اصولی اور عقلی بات تھی جسکی طرف میں نے اس احساس کے ساتھ چند لفظوں میں اشارہ کر دیا کہ ابھی یہ تشنہء تفصیل ہے۔ لیکن اہل فہم وفراست پر اتنا بھروسہ ہے کہ وہ اس اجمال کو ذرا سا تامل کے بعد تفصیل کا لباس پہنا سکتے ہیں۔

اس گفتگو سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر نام نہاد مسلمان مختلف گروہوں اور ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے ہیں تو یہ انھی نام نہاد مسلمانوں کی تقسیم ہے، اسلام کی تقسیم نہیں۔ اس بات کی مزید وضاحت کیلئے یہ ارشادِ ربانی ملاحظہ ہو۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٩﴾ ﴿الحجر:٩﴾

ہم ہی نے ذکر حکیم (قرآنِ کریم) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔

۔۔۔ایک ارشاد نبوی ﷺ بھی ہے:

وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ لَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي
أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّ مَنْ لَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ
حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ عَلٰى ذٰلِكَ (متفق علیہ)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود نبی کریم ﷺ سے سنا ہے۔
آپ نے فرمایا کہ ہمیشہ ایک گروہ رہے گا جو امر دین و شریعت کو برپا کرے گا،
ایسے کو نہ تو اپنوں کا عدم تعاون نقصان پہنچا سکے گا اور نہ مخالفین کی مخالفت۔۔
یہاں تک کہ قیامت قائم ہو اور وہ گروہ اپنے اسی حال پر رہے۔

۔۔ایک ارشاد قرآنی اور ملاحظہ ہو:

وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ
الْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٥٥﴾ ﴿الزمر:٥٥﴾

چلو اسکے بہتر پر جو تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل فرمایا،
قبل اسکے کہ اچانک قیامت آجائے اور تمہیں خبر نہ ہو

مذکورہ بالا نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ہی کا دوسرا نام اسلام ہے۔اور یہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک قیامت نہ آجائے۔یہی وجہ ہے کہ قیامِ قیامت سے پہلے اسکی اتباع و پیروی کا حکم دیا جا رہا ہے ورنہ دوسری صورت میں اسکی اتباع کا مطالبہ غیر معقول اور غیر حقیقی قرار پاتا۔قرآن حکیم نے یہ بات بھی بتادی کہ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ کا محافظ خدائے عزوجل ہے،جو گردشِ

لیل ونہار کا شکار نہ ہو سکے گا۔اسی طرح ارشادِ نبویﷺ نے واضح فرما دیا کہ ہر دور میں ایک ایسی مقدس جماعت کا وجود رہے گا جو صحیح معنوں میں اسی اسلام کی حامل ہوگی اور اسی اسلام کی ترویج واشاعت میں مصروف ومنہمک رہے گی جسکی تعلیم قرآن وحدیث نے دی ہے۔

آج اسلامی حکومت دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ہے لیکن اسلام دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہے اور یہ حقیقت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ 'اسلامی حکومت' کچھ اور ہے اور 'دین اسلام' کچھ اور۔ یہ دونوں عین نہیں کہ ایک کے بغیر دوسرا نہ پایا جائے۔ یہ سچ ہے کہ اسلامی حکومت کی موجودگی میں اسلام کا ہونا نہایت ضروری امر ہے۔لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام تو ہو اور اسلامی حکومت نہ ہو، جیسا کہ آجکل مشاہدہ ہے۔بس یہی مادۂ افتراق عینیت کی نفی کیلئے کافی ہے۔ اگر یہ بات فرض کر لی جائے کہ اسلامی حکومت نہیں تو اسلام بھی نہیں۔ایسی صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آج دنیا میں کوئی مسلمان نہیں۔۔۔اس اقرار کے بعد اب کسی سے اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ طرزِ عمل تو کچھ ایسا ہی ہے گویا غیر مسلموں کے سامنے اسلامی حکومت کے قیام کا منصوبہ رکھا جائے!

اسلامی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد وہ نظامِ خلافت دوبارہ قائم نہ ہو سکا لیکن اسلام رہا اور وہ فنا نہیں ہوا۔خلافت کا عروج وزوال دراصل اسلام کا عروج وزوال نہیں۔اسلام وہ آفتاب ہے جو ہمیشہ نصف النہار پر رہا ہے اور رہے گا۔

اب ذرا دیر کیلئے فرض کر لیجئے کہ ساری دنیا میں خلافت راشدہ قائم ہوگئی اور مسلمان سچا مسلمان بن گیا۔اب نہ چوری اور ڈکیتی کا کہیں نام ونشان ہے اور نہ بدکاری و بدقماشی کی گرم بازاری ہے۔اب پورے طور پر برائیاں ختم ہوگئی ہیں اور نیکیوں کا تسلط ہوگیا ہے۔اس صورتِ حال پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اسلام کا مزاج یہ

چاہتا ہے کہ ساری دنیا میں اسلام کی حکومت نہ ہو اور نہ اسلامی حکومت میں سارے افراد نیک سیرت ہوں ورنہ مکمل اسلام پر عمل ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسلئے کہ جب کوئی شخص چوری ہی نہ کرے گا تو 'قانونِ قطع ید' کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے؟ جب کہیں کوئی کافر ہی نہیں تو پھر 'قانونِ جہاد' پر عمل کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس مہمل اور بے معنی اعتراض پر آپ متبسم ہوں گے اور خیال کریں گے کہ معترض نے اسلام کا مزاج ہی نہیں سمجھا اور نہ اسے یہی معلوم ہے کہ اسلام کی کون سی دفعہ کس وقت اور کس ماحول کیلئے ہے!

اللہ تعالیٰ پر اس کی جملہ شیونات ربانیہ اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ان کی تمام صفات مصطفویہ کی تصدیق کے ساتھ ایمان لانا ہی اسلام کا وہ پہلا اور بنیادی مطالبہ ہے جس کا مخاطب سارا عالم ہے۔ اسکے بعد جملہ فرائض، واجبات اور موکدات خاص طور پر ان کیلئے ہیں جو اپنے دل و دماغ کے اعتبار سے مومن بن چکے ہیں۔ یہاں اس بات کو ذہن میں ضرور رکھئے کہ اسلام عرب و عجم کی طویل و عریض زمین کا نظام سنبھالنے کیلئے نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ عربی و عجمی قلوب و اذہان کی اصلاح اس کا اصل مقصود ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اسلام نے اس ثانوی امر کا بھی خاص لحاظ رکھا ہے کہ اہل ایمان کی بتدریج ترقی سے ان کی اجتماعی زندگی کا دائرہ جب وسیع ہوگا تو قدرتی طور پر بہت سارے مسائل بھی پیدا ہونگے اور ان مسائل کے حل کیلئے ایک ایسے نظام کی بھی ضرورت پڑے گی جو آخرت کے حقیقی تصور کے ساتھ مادی یا دینوی زندگی کے تمام تقاضوں کو محیط ہو۔

چنانچہ جب اہل ایمان کی آبادی کو فروغ ہوا اور کشمکش حیات نے نئے نئے مسائل پیدا کئے تو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ایک نظام کی تشکیل کی گئی جسکا دوسرا نام خلافت راشدہ ہے۔ یہاں پھر عرض کر دوں کہ 'خلافت' یا 'حکومت' اسلام کا مقصود

نہیں اور نہ اسلام کی بقا اس پر منحصر ہے۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ ساری دنیا کے انسان عقیدہ وعمل کے لحاظ سے مومن کامل ہو جائیں، ان سے صدور معصیت وخطا ممکن ہی نہ رہے۔ اور اسلام کے جملہ مطالبات کو پورا کرنا انکی فطرت بن جائے تو ایسی صورت میں اب نہ کسی ظاہری نظام حکومت کی ضرورت ہے اور نہ کسی کے خلیفہ یا امیر بننے کی حاجت ہے۔ اسلئے کہ انسانی برادری کے ہر فرد کا عمل اسلام کی حکمرانی اور اس کے تسلط کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس مثال سے یہ بتانا مقصود نہیں کہ اسلامی نظام حکومت کا قیام بے سود اور عبث ہے بلکہ منشاء کلام یہ ہے کہ اسلام کے وجود کا انحصار کسی حکومت کی طاقت وشوکت پر نہیں ہے۔ وہ بغیر حکومت کے بھی قائم ودائم رہا ہے اور رہے گا۔

بعض لوگوں کو اسلام کے اصول جو آج خلافِ فطرت نظر آتے ہیں، تو اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فکر ونظر کا صحیح توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ اسی عدم توازن نے انکی فطرت میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے اور جب انکی فطرت ہی صحت سے عاری ہے تو اسلام کے اٹل اور غیر مبدل اصول اس سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتے ہیں! ان لوگوں کی کج نظری کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی کہ انھوں نے اپنی مسخ شدہ فطرت ہی کو معیارِ حق بنالیا ہے اور اپنی زندگی کو اسلام کا تابع بنانے کے بجائے اسلام ہی کو اپنی خواہشات کا محکوم بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں خلفشار اور کشاکش کا پیدا ہونا ضروری ہے اور اسکے خوفناک مناظر ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔

اسلام نے ساری انسانیت کو جس ضابطہء حیات کی تعلیم فرمائی ہے اور ہر شعبہ حیات کیلئے جو قوانین مرتب کئے ہیں، پہلے ان کا نفاذ ضروری ہے، پھر دنیا کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ زندگی کی محرومیوں کو دور کرنے کیلئے اسلامی اصولوں کی کس قدر ضرورت ہے؟ ۔۔۔ نافذ کرنے سے قبل ہی اسلامی اصولوں کو ناقابل عمل

کہنا ایک پاگل کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مخالفین نے اسلام کے مقابل جو اپنے نظام کی تشکیل کی ہے تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ اسلام کو ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔ یہ تو محض ان کا جذبۂ بغض وعناد ہے، جس نے انھیں ایک پاکیزہ نظامِ زندگی سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اور غضب تو یہ ہے کہ وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کا مصنوعی نظام اسلامی نظام کا جواب اور توڑ ہے۔ شاید اہل نظر اس حقیقت سے غافل نہیں کہ مخالفین کے بنائے ہوئے نظام کو جس کا مقصد کم سے کم عیش ونشاط کی کا مجوئی اور زیادہ سے زیادہ اقوامِ عالم پر بے محابہ چیرہ دستی ہے، اسلام کے محکم نظامِ حیات سے کیا نسبت؟

چہ نسبت خاک را با عالم پاک!

اس مختصر تمہیدی گفتگو کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آپ اپنے سوالات کا بالترتیب جواب ملاحظہ فرمایئے:

﴿۱﴾۔۔۔اسی اسلام کی دعوت دیجئے جو نبی کریم ﷺ لائے تھے، جو آج بھی موجود ہے اور جس سے کٹ کٹ کر باطل جماعتیں نئے نئے نام سے متعارف ہو چکی ہیں۔ لیکن جماعت سازیوں کے باوجود وہی پرانا اسلام آج بھی اکثریت کے دل ودماغ پر حکومت کر رہا ہے۔ اور جسے خواب وخیال سمجھنا قرآن وحدیث کا صریح انکار ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔اسلام کا مزاج کیا ہے؟ اسے تمہید میں پیش کر چکا ہوں۔ آپ دوبارہ ملاحظہ کیجئے۔ اسلام کا ایک ہی رنگ ہے، ایک ہی روپ ہے، اس میں نہ کبھی کوئی فرق آیا اور نہ آج ہے۔ البتہ خلافت وحکومت کے بہت سے ادوار ہیں اور ہر دور کے مختلف رنگ اور مختلف روپ تاریخ کے صفحات سے ظاہر ہوتے ہیں۔

﴿۳﴾۔۔۔خلافت راشدہ کے بعد صحابہ اور تابعین کا مقدس وجود اس بات کی دلیل ہے کہ اگر چہ وہ دورِ خلافت نہیں رہا، لیکن اسلام اپنے تقدس وطہارت اور عظمت ورفعت کے ساتھ اس زمانہ میں موجود تھا اور ان پاکیزہ نفوس کے دل ودماغ پر حکومت کر رہا

تھا۔ اسی طرح ہر دور میں ایک مقدس جماعت کا وجود بتا رہا ہے کہ اسلام کا آفتاب نیم روز کبھی ڈھلا ہی نہیں۔ اس علم کے بعد اسلام کو خیالی اور وہمی کہنا یا سمجھنا، خیال و وہم سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا ہے۔ اب ہمارے لئے اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم اپنی دنیوی اور اخروی فلاح و بہبودی کیلیۓ صدقِ دل سے پورے اخلاص کے ساتھ اسلام کو اپنائیں اور اس کو اپنی عملی زندگی میں داخل کرلیں۔ آیہ کریمہ:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝

پر توجہ دیں۔۔۔ انھیں، مُنعِم عَلَیہِم یعنی انبیاء، صدیقین، شہدا، نیز صالحین کے راستے پر چلیں اور آیہ کریمہ:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ﴿النساء: ۶۹﴾

۔۔۔ سے جو ہدایت مل رہی ہے، اسے بسر و چشم قبول کریں۔

تحریم اور فلسفۂ تحریم

بعض حدیثوں میں آیا ہے:

'اِنَّ اِبرَاهِیمَ حَرَّمَ مَكَّةَ فَجَعَلَهَا حَرَمًا'

۔۔۔یہاں 'تحریم' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں شارحین حدیث کے مختلف قول ملتے ہیں۔کوئی کہتا ہے کہ 'تحریم' سے مراد 'دعائے تحریم' ہے۔کسی نے کہا کہ اس سے مراد 'اعلانِ حرمت' و 'تبلیغ حکم تحریم' ہے۔۔۔'دعائے تحریم' مراد لینے والے محققین کی دلیل یہ ہے کہ حدیث مذکور میں 'حرم' کے فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں تو اگر 'جعل' کا فاعل بھی انہی کو تسلیم کرلیا جائے تو حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ 'ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام کردیا تو انھوں نے مکہ کو حرام کردیا۔اس صورت میں 'فَجَعَلَهَا حَرَمًا' کا پورا جملہ بیکار ہوجاتا ہے۔اسلئے 'حرم' کے فاعل تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں لیکن 'جعل' کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور یہاں 'تحریم' سے مراد 'دعائے تحریم' ہے۔۔۔اب حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ 'حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ وہ مکہ کو حرام کر دے تو اللہ نے اس کو حرام فرمادیا۔۔۔اور جو 'اعلان و تبلیغ' مراد لیتے ہیں، انکا کہنا ہے کہ 'حرمت مکہ' بہت پہلے سے چلی آرہی تھی لیکن 'طوفانِ نوح' کے بعد اسکی حرمت کے 'مبلغ اوّل' سیدنا ابرہیم علیہ السلام تھے، لہٰذا 'تحریم' کی نسبت انکی طرف کردی گئی۔۔۔

ان ساری توجیہوں اور تاویلوں کا سبب یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں ہے:

'اِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللّٰهُ'

بیشک اس شہر مکہ کو اللہ نے حرام فرمایا ہے

---اور بعض حدیثوں میں ہے کہ:

مکہ حرام بہ حرمت اللہ ہے

--- یہ روایتیں چونکہ روایت اولیٰ کے معارض ہیں لہٰذا دونوں قسموں کی روایتوں سے دفع تعارض کیلئے شارحین کرام کو مذکورۃ الصدر تاویلیں کرنی پڑیں۔ اگر روایتوں میں 'تحریم' کی نسبت اللہ کی طرف نہ ہوتی تو یہ اشکال پیدا نہ ہوتا۔ تو پھر کسی تاویل کی حاجت بھی نہ ہوتی۔ لہٰذا 'حدیث تحریم ابراہیمی' کو دلیل بنا کر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں جہاں 'تحریم' یا 'تحلیل' کی اسناد نبی کریم ﷺ کی طرف گئی ہے وہاں صرف 'تبلیغ واعلام' یا 'دعائے تحریم' ہی مراد ہے، اسلئے کہ وہ دلیل اس دعویٰ کیلئے مفید نہیں---

اسکے چند وجوہ یہ ہیں:

﴿اوّلاً﴾ ---دعویٰ عام ہے، دلیل خاص ہے۔ اور دلیلِ خاص دعویٰ عام کو نہیں ثابت کر سکتی۔

﴿ثانیاً﴾ ---دعویٰ یہ ہے کہ حضور آیہ ءرحمت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کی 'تحریم' و 'تحلیل' کا اختیار نہیں دیا ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو مکہ کی تحریم کی ہے وہاں 'تحریم' سے مراد 'دعائے تحریم' یا 'تبلیغ واعلام' ہے---دعویٰ مذکور سے اس دلیل کو کوئی تعلق ہی نہیں---اسی قسم کا دعویٰ و دلیل کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ 'مارے گھٹنا پھوٹے سر'---یا یوں کہیے کہ دعویٰ یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی حضور نبی کریم ﷺ کی طرف 'تحریم' یا 'تحلیل' کی نسبت کی گئی ہے وہاں یا تو 'دعائے تحریم' و 'دعائے تحلیل' مراد ہے یا 'تبلیغ تحریم' و 'تبلیغ تحلیل'، یعنی معنیٰ 'حقیقی' مراد نہیں اور دلیل یہ ہے کہ 'تحریم ابراہیمی' میں 'تحریم' کا معنیٰ 'حقیقی' مقصود نہیں۔ اس دعویٰ و دلیل کے تعلق کا بھی وہی حال ہے جو اسکے پہلے والے دعویٰ و دلیل کا تھا۔

﴿ثالثاً﴾ ---'تحریم ابراہیم' کی تاویل 'دفع تعارض' کیلئے ہے۔ معنیٰ 'حقیقی'

مراد لینا متعذر تھا لہٰذا 'مجاز' مراد لیا گیا۔

﴿رابعاً﴾ ۔۔۔ 'تحریم ابراہیم' میں معنی 'حقیقی' مراد لینے پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ قبل سیدنا ابراہیم علیہ السلام 'تحریم مکہ' نہ تھی۔ حالانکہ یہ خلافِ واقعہ ہے۔ لہٰذا یہاں معنی 'مجازی' ہی مراد ہوگا۔

۔۔۔ شق رابع کا ذکر میں نے صرف اسلئے کر دیا ہے کہ بعض علماء نے یہ توجیہہ بھی کی ہے، اگر چہ میں اس توجیہہ کی تائید میں کوئی روایت نا پا سکا بلکہ جتنی روایتیں میرے سامنے آئی ہیں انکے ظاہری الفاظ کچھ اسکے برخلاف ہی نظر آتے ہیں۔۔۔ الحاصل۔۔۔ اس توجیہہ سے ان بزرگوں نے کیا مراد لیا ہے، وہاں تک میرا فہم ناقص نہیں پہنچ سکا۔

ان بزرگوں کے قول میں اس تاویل کی بھی گنجائش ہے کہ چونکہ 'شرائع و احکام' کا حاکم اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے جو ہر ہر حکم کی اپنی تشریعِ قدیم میں 'تحلیل وتحریم' فرما چکا ہے تو اب کسی نبی کی 'تحلیل یا تحریم' بظاہر ان کی 'تحلیل وتحریم' ہے، لہٰذا اسکی نسبت انکی طرف جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ اسی تشریعِ قدیم کا 'اعلام' اور اسی کی 'تبلیغ' ہے۔ گویا ہم نے تشریعِ حادث کے پیش نظر نبی ﷺ کو 'محرم ومحلّل' کہا اور ان بزرگوں نے تشریعِ قدیم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان کی تعبیر 'مبلغ ومعلّم' سے کی۔ ان دونوں کا مآل ایک ہی ہے۔ انکے مابین کوئی تعارض نہیں، صرف لفظوں کے استعمال کا فرق ہے۔ لہٰذا اگر اس معنیء مذکور میں ان کو 'مبلغ ومعلّم تحریم' کہا جائے تو اس سے انکی تشریعی اختیارات پر آنچ نہیں آتی۔

﴿خامساً﴾ ۔۔۔ 'حدیث تحریم ابراہیمی' میں اگر 'تحریم' کا 'حقیقی' معنی مراد لیا جائے جب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس صورت میں حدیث کا معنی یہ ہوگا۔۔۔

'حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کی تحریم کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا'

۔۔۔ یعنی انکی 'تحریم' کو منسوخ نہیں فرمایا بلکہ باقی رکھا۔۔۔ یا۔۔۔ انکی 'تحریم' کو غایت

تقرب' کی بناء پر اپنی 'تحریم' قرار دیا تا کہ لوگ سمجھ لیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی 'تحریم' انکے خدا کی 'تحریم' ہے۔جس طرح خدا کی تحریم واجب التعمیل ہے اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی تحریم بھی۔اسی مفہوم کو دوسری روایتوں میں یوں کہا گیا ہے کہ۔۔۔

'اِنَّ ھٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَ اللّٰہَ'

اس شہر مکہ کو اللہ نے حرام فرما دیا

۔۔۔گویا اس حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فعل کو خدا کا فعل قرار دیا تو یہ۔۔۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ﴿الانفال: ١٧﴾

۔۔۔کے قبیل سے ہو گیا۔

اس توجیہہ سے دونوں طرح کی روایتوں میں بہ آسانی توفیق ہو جاتی ہے اور کوئی تعارض نہیں رہتا اسلئے کہ اس توجیہہ کا حاصل یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں 'تحریم ابراہیمی' کی نسبت خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف کی اور کہیں بارگاہِ خداوندی میں سیدنا خلیل اللہ علیہ السلام کے مقامِ خلت وغایت تقرب کے پیش نظر انکے فعل کی نسبت ان کے رب کی طرف فرما دی۔۔۔حدیث تحریم ابراہیمی میں ہے۔۔۔

'اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ حَرَّمَ مَکَّۃَ فَجَعَلَھَا حَرَامًا وَاِنِّیْ حَرَّمْتُ الْمَدِیْنَۃَ'

بیشک ابراہیم نے مکہ کی تحریم کی تو انھوں نے اسکو حرم بنا دیا اور میں نے مدینہ کو حرام قرار دیا

۔۔۔اس صورت میں 'جعل' کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی رہے اور ہر ہر لفظ اپنے حقیقی معنی پر رہا، نیز کوئی جملہ بھی بیکار نہ رہا۔

اگر اس حدیث کا یہ ترجمہ کیا جائے کہ۔۔۔

'یقیناً ابراہیم نے مکہ کی حرمت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے
اس کو حرام کر دیا اور یقیناً میں نے مدینہ کو حرام کیا'

۔۔۔اس صورت میں بھی کم از کم اتنا تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اگر مکہ کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا تو مدینہ کو سرکارِ مدنی نے حرام قرار دیا۔ یعنی اللہ نے اپنے ذاتی اختیار سے مکہ کو 'حرم' بنا دیا تو رسول نے خدا کے دیئے ہوئے اختیار سے مدینہ کو 'حرم' فرما دیا۔ حدیث شریف کا طرز بیان اسے تسلیم کرنے پر مجبور کر رہا ہے کہ اگر دونوں جگہ 'حرمت' سے مراد 'حرمت اللہ' ہوتی تو الفاظِ حدیث یوں نہ ہوتے۔۔۔

فَجَعَلَهَا حَرَامًا وَاِنِّیْ حَرَّمْتُ الْمَدِیْنَةَ

مگر یہ سوال اپنی جگہ پر رہا کہ اس توجیہہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تشریع حادث میں 'تحریم مکہ' زمانہء خلیل کے پہلے نہ تھی؟۔۔۔ میں عرض کروں گا کہ جس طرح اس توجیہہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے اسی طرح اسلافِ کرام کی اس تاویل پر بھی یہی سوال ہوتا ہے کہ 'تحریم ابراہیمی' میں 'تحریم' سے 'دعائے تحریم' مراد لیا جائے۔ اسلئے کہ جب پہلے تحریم واقع ہو چکی تھی تو پھر 'دعائے تحریم' اور اسکے بعد 'من جانب اللہ تحریم'، جیسا کہ حدیث کا ظاہر بھی یہی بتا رہا ہے، تحصیل حاصل ہے۔ اسلافِ کرام کی اس توجیہہ اور حدیث شریف کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ شریف کی عظیم الشان تقدس وطہارت کے باوجود تشریعِ حادث میں قبل سیدنا خلیل 'تحریم مکہ' نہیں تھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی دفع تعارض کیلئے جو توجیہہ پیش کی ہے اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ زمانہء خلیل سے پہلے 'تشریع حادث' میں 'تحریم مکہ' نہ تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> 'حکم الٰہی قدیم ہے اور وہی شرائع واحکام کا حاکم اعلیٰ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تشریع سے جو حکم ہوتا ہے وہ اسی حکم قدیم پر دال ہے، لہٰذا جن حدیثوں میں اِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللّٰهُ آیا ہے اگر اسکی تاویل کی جائے کہ لَمَّا حَرَّمَهٗ اِبْرَاهِیْمُ فَدَلَّ ذَالِكَ عَلٰى اَنَّهٗ حَرَّمَهُ اللّٰهُ فِیْ تَشْرِیْعِهِ الْقَدِیْمِ یعنی جب حضرت ابراہیم نے تحریم کردی تو اس سے پتہ چل گیا کہ اپنی تشریع قدیم میں اللہ نے اس کو حرام فرما دیا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں'

۔۔۔۔اور یہ ظاہر ہے کہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی نہیں اور صرف انکی طرف سے تشریع ہی نہیں، بلکہ کائنات میں جو ہوا، جو ہوگا، ہر حرکت وسکون تابع فرمانِ الٰہی ہے اور ساری کائنات کے وجود کے پہلے ہی جملہ احکامات کی تحلیل وتحریم اللہ تعالیٰ نے اپنی تشریع قدیم میں فرمادی تھی۔لیکن اس کا اظہار مشیت الٰہی کے مطابق ہوتا رہا۔اگر بعض احکام کی تحلیل وتحریم بذریعۂ وحی متلو کی، تو بعض کی بذریعۂ وحی غیر متلو۔بعض احکامات کی تحلیل وتحریم کی نسبت براہِ راست اپنی طرف کی، تو بعض کی لبہائے نبوت کی طرف: وَهٰذَا فَضۡلُ اللّٰهِ يُعۡطِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ۔
۔۔۔شاہ صاحب کی توجیہہ کو یہ حدیث شریف قوت بخش رہی ہے۔
فتح مکہ کے دن حضور نبی کریم نے فرمایا۔۔۔

اِنَّ هٰذَا الۡبَلَدَ حَرَّمَ اللّٰهُ يَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضَ فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرۡمَةِ اللّٰهِ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ

۔۔۔یعنی۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو اسی دن حرام فرمادیا تھا جبکہ زمین وآسمان کو پیدا فرمایا
(بتانا یہ ہے کہ اسکی تحریم امر قدیم ہے جیسا کہ مشکوٰۃ شریف کے حاشیہ
پر اس بات کی تصریح ہے) تو وہ قیامت تک کیلئے حرام بحرمۃ اللہ ہے

۔۔۔لہٰذا 'اعلام وتبلیغ' مراد لینے والوں کے قول کی وہ تاویل کردینی مناسب ہے جس کی طرف شق رابع میں اشارہ کیا جاچکا ہے۔میری اور شاہ صاحب کی توجیہوں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں جہاں تحریم مکہ کی نسبت اللہ کی طرف ہے وہاں وہ 'تحریم قدیم' مراد لیتے ہیں اور میری توجیہہ کا منشاء یہ ہے کہ 'تحریم مکہ بحرمۃ اللہ' سے مراد یا تو قیامت تک کیلئے 'بقائے تحریم ابراہیمی' ہے۔۔۔یا۔۔۔تحریم کی نسبت اللہ کی طرف اسلئے کردی گئی ہے تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بارگاہِ الٰہی میں غایتِ

قرب ظاہر ہو اور یہ ظاہر ہو جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تحریم کسی عام انسان کی تحریم نہیں، بلکہ رب کی تحریم ہے۔ لہٰذا اس کے واجب التعمیل ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔۔۔ اس صورت میں اس حدیث سے بھی کوئی اشکال پیدا نہ ہوگا جس میں فرمایا گیا ہے۔۔۔

اِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ وَلَمْ يُحَرِّمُهَا النَّاسُ

۔۔۔یعنی۔۔۔ مکہ کو اللہ نے حرام فرمایا ہے کسی انسان نے نہیں

۔۔۔مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ 'تحریم ابراہیمی' تو صرف ایک انسان کی تحریم ہے بھلا وہ کیسے واجب التعمیل ہو سکتی ہے۔ تو رب کی طرف نسبت کر کے یہ جواز دے دیا گیا کہ 'تحریم ابراہیمی' انکے رب کی تحریم ہے اسکو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو تو صرف ایک انسان نے حرام کیا ہے۔

'تحریم ابراہیمی' میں تحریم سے مراد 'دعائے تحریم' ہے! اسکی تائید میں ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ حضور نے فرمایا ہے۔۔۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرَاهِيمَ عَبْدُكَ وَخَلِيْلُكَ وَنَبِيُّكَ
وَاَنِّيْ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَاَنَّهٗ دَعَاكَ لِمَكَّةَ
وَاَنَا اَدْعُوْكَ لِلْمَدِيْنَةِ بِمِثْلِ مَادَعَاكَ لِمَكَّةَ

اے اللہ بیشک ابراہیم تیرے بندے اور خلیل و نبی ہیں
اور میں بھی تیرا بندہ و نبی ہوں۔ انھوں نے مکہ کیلئے تجھ سے
دعا کی تھی میں مدینہ کیلئے تجھ سے دعا کر رہا ہوں،
اسی قسم کی دعا جس طرح کی ابراہیم نے مکہ کیلئے کی تھی۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے 'تحریم مکہ' کی صرف دعا کی تھی، خود تحریم نہیں فرمائی تھی۔ اسی طرح ہمارے نبی کریم ﷺ نے بھی تحریم مدینہ

کیلئے دعا فرمائی ہے۔۔۔۔میں عرض کروں گا کہ مذکورہ بالا حدیث سے یہ نتیجہ نکالنے سے پہلے میری چند گزارشات کو ملحوظ خاطر رکھ لیا جائے۔

﴾اوّلاً﴿۔۔۔ دعائے ابراہیمی کے الفاظ یہ ہیں۔۔۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾البقرہ:۱۲۶﴿

اور جب ابراہیم نے اللہ سے دعا کی ،اے رب اس شہر مکہ کو امن والا شہر بنا دے اور اس میں رہنے والے مومنین کو پھلوں کا رزق عطا فرما۔

۔۔۔دیکھئے اس میں دعائے خیر و برکت ہے، نہ کہ دعائے تحریم۔ پتہ چلا کہ حدیث شریف میں جس دعا کا ذکر ہے وہ یہی دعائے خیر و برکت ہے۔

﴾ثانیاً﴿۔۔۔حدیث شریف کے سیاق وسباق سے بھی صرف یہی پتہ چلتا ہے کہ حضور نے مدینہ شریف کیلئے خیر و برکت کی دعا کی تھی ،جیسا کہ حضرت ابراہیم نے مکہ شریف کیلئے خیر و برکت کی دعا فرمائی تھی۔۔۔الحاصل۔۔۔اس حدیث میں 'تحریم' یا 'دعائے تحریم' کا کوئی سوال ہی نہیں۔ پوری روایت کے ابتدائی کلمات یہ ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّاسُ اِذَارَأَوْااَوَّلَ الثَّمَرَةِ جَاءُ وْابِهٖ اِلَى النَّبِیِّ ﷺ فَاِذَااَخَذَهٗ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَافِیْ ثَمَرِنَاوَبَارِكْ لَنَافِیْ مَدِيْنَتِنَا وَبَارِكْ لَنَافِیْ صَاعِنَاوَبَارِكْ لَنَا فِیْ مُدِّنَا اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَبْدُكَ وَخَلِيْلُكَ وَنَبِيُّكَ وَاِنِّیْ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَاِنَّهٗ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَاَنَااَدْعُوْكَ لِلْمَدِيْنَةِ بِمِثْلِ مَادَعَاكَ لِمَكَّةَ ﴾مشکوۃ شریف﴿

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ لوگوں کا دستور تھا کہ جب پہلا پھل دیکھتے تو بارگاہِ رسالت میں لاتے۔حضور اس کو دستِ مبارک میں لیکر یہ دعا فرمایا کرتے: اے اللہ ہمارے پھلوں ، ہمارے شہر، ہمارے صاع اور

ہمارے مد میں برکتیں عطا فرما۔ اے اللہ بیشک ابراہیم تیرے بندے اور خلیل و نبی ہیں اور میں بھی تیرا بندہ و نبی ہوں۔ انھوں نے مکہ کیلئے تجھ سے دعا کی تھی، میں مدینہ کیلئے تجھ سے دعا کر رہا ہوں، اسی طرح کی دعا جس طرح کی ابراہیم نے مکہ کیلئے کی تھی۔

۔۔۔اسکے بعد حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ حضرت نبی کریم ﷺ یہ دعا فرما کر لانے والے کے چھوٹے بچے کو طلب فرماتے اور اُسکو یہ پھل عطا فرمادیا کرتے۔ پوری حدیث کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہاں صرف دعائے خیر و برکت کا ذکر ہے۔ 'تحریم' یا 'دعائے تحریم' سے اسکا کوئی تعلق نہیں، ورنہ ہر بار نئے پھل کو ملاحظہ فرما کر اس دعا کے کیا معنی؟ کیا 'تحریم' یا 'دعائے تحریم' کوئی ایسی چیز ہے جسکا اعادہ ہر نئے پھل کو دیکھ کر ضروری ہے؟ لہٰذا ثابت ہوگیا کہ 'تحریم ابراہیمی' میں 'تحریم' سے 'دعائے تحریم' مراد لینے والوں کیلئے میرے فہم ناقص میں یہ حدیث مفید نہیں۔

﴿ثالثاً﴾۔۔۔حضور نے فرمایا ہے:

اِنِّیۡ اُحَرِّمُ مَابَیۡنَ لَابَتَیِ الۡمَدِیۡنَةِ

میں مدینہ کے سنگستانوں کے مابین کو حرام کرتا ہوں

۔۔۔اور فرمایا۔۔۔

اِنَّ اِبۡرَاهِیۡمَ حَرَّمَ مَكَّةَ فَجَعَلَهَا حَرَامًا وَاِنِّیۡ حَرَّمۡتُ الۡمَدِیۡنَةَ

ابراہیم نے مکہ کی تحریم کی تو انھوں نے اس کو حرم بنادیا اور میں نے مدینہ کو حرام کردیا

۔۔۔اور فرمایا۔۔۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبۡرَاهِیۡمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَاِنِّیۡ اُحَرِّمُ مَابَیۡنَ لَابَتَیۡهَا

اے اللہ ابراہیم نے مکہ کو حرام کیا اور میں مدینہ کے سنگستانوں کے مابین کو حرام کرتا ہوں

۔۔۔حضرت سلیمان بن ابو عبداللہ نے فرمایا:

حَرَّمَ الْمَدِيْنَةِ الَّذِیْ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ
حرم مدینہ جس کو رسول اللہ ﷺ نے حرام فرمایا

۔۔۔انھوں نے حضرت سعد ابن وقاص رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل فرمایا:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ حَرَّمَ ھٰذَاالْحَرَمُ
اس حرم کو رسول اللہ ﷺ نے حرام فرمایا ہے

۔۔۔ان احادیث وآثار میں تحریم کی نسبت غیر مبہم لفظوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضور نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہے اور انکے حقیقی معنی مراد لینے میں کوئی قباحت بھی نہیں، تو معنی 'حقیقی' سے عدول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

۔۔۔بعض حدیثوں کے الفاظ اس طرح کے بھی ملتے ہیں:

حَرَّمَ مَابَیْنَ لَابَتَی الْمَدِیْنَۃِ عَلٰی لِسَانِیْ
مدینہ کے دونوں سنگستانوں کا درمیانی حصہ میری زبان پر حرم ہوگیا (یا۔۔حرم بنادیا گیا)

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی حَرَّمَ عَلٰی لِسَانِیْ مَابَیْنَ لَابَتَی الْمَدِیْنَۃِ
اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے دونوں سنگستانوں کے درمیانی حصہ کو میری زبان پر حرام کردیا

۔۔۔ان حدیثوں میں 'حرمت وتحریم' کی نسبت اللہ کی طرف دیکھ کر کوئی یہ نتیجہ نہ نکالے کہ یہ 'حرمت وتحریم' بذریعہ سیدنا جبرائیل امین ہوئی ہے۔اسلئے کہ یہ ایسا دعویٰ ہوگا کہ جس کی دلیل نہیں۔ چونکہ تبلیغ کا حکم، اعلان کا امر، اور تشریع کا اذن، نیز اس کے علاوہ رسولِ کریم ﷺ جتنے صفات وکمالات کے حامل ہیں، وغیرہ وغیرہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے فضل وعطا سے ہیں۔اسی کی قدرت دینے سے ہیں۔تو اس سبب سے اگر 'حرمت وتحریم' کی نسبت اللہ کی طرف کردی گئی (جو 'حرمت وتحریم' کا اذن دینے والا ہے) تو یہ بارگاہِ الٰہی میں نبی کریم ﷺ کا کمالِ ادب ہوا۔اس سے یہ لازم

نہیں آتا کہ جن حدیثوں میں تحریم یا حرمت کی نسبت براہِ راست نبی کریم ﷺ کی طرف ہو وہاں اسکے 'حقیقی' معنی مراد نہ ہوں۔ اور نہ یہی لازم آتا ہے کہ وہ اپنی حرام کردہ چیزوں کی 'حرمت و تحریم' کی نسبت بطورِ تحدیث نعمت اپنی طرف نہ کریں۔۔۔ بالفرض۔۔۔ اگر ان حدیثوں کا یہ مطلب لیا جائے کہ رسول کے ذریعہ اللہ نے حرمت کا اعلان کردیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بذریعہ سیدنا جبرائیل علیہ السلام اس اعلان کا حکم دیا ہو۔ بلکہ اسکا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ 'تشریع قدیم' میں اللہ نے اسکی 'تحریم' فرمادی تھی اور اُس 'حکم قدیم' کا اعلان 'تفویض احکام' کا حق دیکر رسول کے ذریعہ کرایا۔ اس معنی میں رسول کا مبلغ و معلم ہونا اُنکے تشریعی اختیارات کے منافی نہیں۔

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ 'حرمت و تحریم مکہ و مدینہ' سے متعلق جتنی حدیثیں میں نے تحریر کی ہیں اور اس معنی میں اور جو دوسری حدیثیں ہیں ان سب میں تاویلات کی کافی گنجائش ہے اور دلائل ہر ہر تاویل کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہر تاویل اپنی جگہ پر حجت ہے۔ لہٰذا نہ تو ان احادیث کو نبی کریم ﷺ کے اختیاراتِ تشریعی کی نفی میں پیش کرسکتے ہیں اور نہ ہی انکی بنیاد پر اتنا بڑا دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ جہاں جہاں تحریم کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف ہوگی، وہاں صرف 'دعائے تحریم' یا وہ 'تبلیغ و اعلام' ہی مراد ہوگا، جسکا حکم بذریعہ سیدنا جبرائیل علیہ السلام دیا گیا ہو۔ بلکہ جو تاویل رسول کریم ﷺ کے 'اختیاراتِ تشریعی' کو ثابت کرنے والی ہوگی اسکو اسکے ماسوا پر ترجیح حاصل ہے۔ اسلئے کہ 'اصولِ فقہ' میں یہ بات طے ہوچکی ہے کہ۔۔۔

اَلْمُثْبِتُ اَوْلٰی مِنَ النَّافِیْ ﴿نورالانوار﴾

ثابت کرنے والے دلائل نفی کرنے والے دلائل پر ترجیح رکھتے ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صلی اللہ علیہ وسلم

بِاِسْمِهٖ سُبْحَانَہٗ

اَلتَّحْقِيْقُ الْبَارِعِ فِیْ حُقُوْقِ الشَّارِعِ

رسولِ اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات

تالیف

محدث اعظم ہند، حضرت علامہ سید محمد اشرفی جیلانی، کچھوچھوی رضی اللہ عنہ

استفتاء

﴿۱﴾ ---کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ---نماز پنجگانہ فرض ہیں۔اس میں سے تین وقت کی نماز آنحضرت ﷺ نے کس صحابی کو معاف فرمادی۔ یہ کس حدیث میں ہے اور (کیا) وہ اس مرتبہ کی ہے کہ قرآنِ شریف کی ناسخ ہوسکتی ہے یانہیں؟

﴿۲﴾ ---کیا رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال فرمادیں اور جس چیز کو چاہیں حرام فرمادیں؟ یہ اختیار کس آیت اور حدیث میں ہے؟ حضراتِ شیعہ اپنے ائمہ کو بھی یہی اختیار دیتے ہیں۔ یہ اہلسنّت والجماعت کے نزدیک صحیح ہے یانہیں؟

بَیِّنُوْا بِالْکِتَابِ تُوْ جَرُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ۔

(مستفتی) محمد عبدالرحمٰن ڈھالگرٹولہ، جون پور

تاریخ ۱۵، اپریل ۱۹۳۸ء

الجواب اللّٰھم ھد ایۃ الحق والصّواب

﴿۱﴾۔۔۔مسند[1] امام احمد[2] رضی اللہ عنہ میں ایسی سند ہے جسکے تمام راوی ثقہ اور رجال صحیح مسلم[3] سے ہیں یہ حدیث مروی ہے کہ:

حَدَّثَنَامُحَمَّدُ[4] بْنُ جَعْفَرَ ثَنَا شُعْبَۃُ[5] عَنْ قَتَادَۃَ[6] عَنْ نَصْرِ[7] بْنِ عَاصِمٍ عَن رَّجُلٌ مِّنهُمْ رضی اللہ عنہم اَنَّہٗ اَتَی النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَسْلَمَ عَلٰی اَنَّہٗ لا یُصَلّی اِلَّا صَلَا تَینَ فَقَبِلَ ذٰلِكَ مِنہُ۔

۔۔۔یعنی۔۔۔

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوکر اس شرط
پر ایمان لائے کہ صرف دو ہی نمازیں پڑھا کروں گا،
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرما لیا۔

ایسے نو واقعات کی فہرست مجمل طور پر کتابِ مستطاب 'اَنمُوذَجُ اللَّبِیب فی خصائص الحبیب'، میں امام جلال الدین سیوطی[8] رضی اللہ عنہ نے درج کی ہے کذافی الامن والعُلٰی للمجدد للمائۃ الحاضرۃ۔ اس قسم کے واقعات میں نسخ[9] کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض احکامِ شریعت سے لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مستثنیٰ فرما دیا۔ اور جو چیز تمام اُمت پر فرض تھی اور ہے یا حرام تھی اور ہے، وہ حکم اس شخص خاص کیلئے نہ رہا۔ اسی طرح اس قسم کے واقعات کی روایات میں ایسی قوت کا دیکھنا جو ناسخِ قرآن شریف ہو سکے، بڑی بے علمی کی بات ہے، کیونکہ اوّل تو یہ موقع نسخ کا نہیں۔ دوسرے اگر نسخ ہی مان لیا جائے، تو اصل ناسخ اس شخص[10] کیلئے جسکے حق میں نسخ ہوا وہ ارشاد ہے جو لبِ پاکِ مصطفٰے نے فرمایا اور اس شخص نے خود اپنے کانوں سے اس ارشاد کو سُنا جس میں راویوں کا کوئی واسطہ نہیں، تو

اس شخص کیلئے وہ ارشادِ نبوی حجت قطعیہ سے ہوگیا، جس سے بڑھ کراور قوی تر شریعت مطہرہ میں کوئی دلیل ہی نہیں۔ البتہ اس واقعہ کی روایت ہم لوگوں تک راویوں کے ذریعہ سے پہنچی اور اس روایت میں ہم لوگوں کے حق میں اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اختیار تھا کہ جس کو چاہیں اور جس حکم سے چاہیں مستثنیٰ فرمادیں۔ یہ بات ہمارے نبی کریم ﷺ کے فضائل و خصائص سے ہے۔ اور بابِ فضائل میں حدیث مذکور بلا فتنہء منکر حجت[۱۱] ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم

﴿۲﴾۔۔۔قرآن کریم میں فرمایا:

۔۔۔پہلی آیت:

۔۔۔ وَمَآ اٰتٰىكُمُ[۱۲] الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ۔۔۔ ﴿سورۃ الحشر:۷﴾

جو حکم وغیرہ رسول تم کو دیں، اس کو اختیار کرو اور جس سے روکیں اس سے باز رہو۔

۔۔۔اور اس آیہء کریمہ کے متعلق ہمالیہ پہاڑ سے زیادہ بھاری حجت مستفتی پر یہ کہ انکے پیشوا مولوی اشرف علی تھانوی کو بھی اپنے ترجمہء قرآن میں تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس آیت سے احکامِ شریعت میں بھی اختیار نبوی ثابت ہوتا ہے۔

۔۔۔دوسری آیت:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ۔۔۔ ﴿الاعراف:۱۵۷﴾

جو لوگ پیروی کرتے ہیں اس نبی ءاُمی کی، جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا
اپنے نزدیک توریت وانجیل میں۔ جو ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے ان کو برائی سے
اور حلال فرماتا ہے ان کیلئے پاکیزہ چیزوں کو اور حرام فرماتا ہے ان پر ناپاکیوں کو۔

۔۔۔تیسری آیت:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۔۔۔ ﴿التوبۃ:۲۹﴾

لڑو ان سے جو نہیں مانتے اللہ کو اور پچھلے دن کو اور نہیں حرام جانتے
جس کو حرام کر دیا اللہ نے اور حرام کر دیا رسول اللہ نے۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔چوتھی آیت:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾ ﴿الاحزاب:۳۶﴾

کوئی حق نہیں کسی مسلمان مرد و عورت کو جبکہ حکم دے اللہ
اور اس کا رسول کسی کام کا کہ ان کیلئے کچھ اختیار رہے اپنے امر سے
اور جو حکم نہ مانے اللہ کا اور جو حکم نہ مانے رسول اللہ کا
وہ بلا شبہ کھلی ہوئی گمراہی میں بہک گیا ہے۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔یہ مشتے نمونہ چند آیات ہیں جن میں قرآن عظیم نے صاف صاف فرمایا کہ رسول اللہ کا ہر 'حکم تشریعی' واجب التعمیل ہے۔ وہ جو چاہیں حکم دیں اور جس چیز سے چاہیں روک دیں۔ رسول اللہ ﷺ حلال فرماتے ہیں اور حرام فرماتے ہیں۔ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ حرام فرما دیں جو اس کو حرام نہ مانے اس سے جہاد کا حکم ہے۔ جس چیز کا رسول اللہ ﷺ حکم دیں اسکو نہ ماننے کا کسی کو اختیار نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو جو نہ مانے وہ سخت گمراہ ہے۔ ان آیاتِ کریمہ میں سے پچھلی آیت کا شان نزول یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے غلام آزاد حضرت زید ابن حارث رضی اللہ عنہ کے نکاح کا پیغام اپنی پھوپھی زاد بہن، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے دیا، جس سے انھوں نے

اور انکے بھائی عبداللہ ابن جحش رضی اللہ عنہ نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ انکے کفو نہ تھے۔ اور شرعاً عورت کو حق حاصل ہے کہ اس بارے میں انکار کر سکے، خصوصاً جبکہ اسکے خاندان کی شرافت ثریا سے بھی بالاتر ہو۔ مگر اس پیام کے نہ ماننے پر اللہ رب العزۃ نے وہ الفاظ ارشاد فرمائے، جو اللہ کے فرض کئے ہوئے کسی کام کو نہ ماننے پر فرمائے جاتے۔ اور پھر اسکے ساتھ آیہء کریمہ میں اپنا نامِ پاک بھی شامل فرما دیا کہ ہم نے کسی عورت پر فرض نہیں فرمایا کہ خواہ مخواہ کسی سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائے۔ لیکن جب ہمارے رسول نے فرما دیا تو وہ ہمارا ہی فرمانا ہو گیا اور وہ بات قطعی ہو گئی اور مسلمانوں کو اسکے نہ ماننے کا کچھ اختیار نہ رہا۔[۱۳] اس بناء پر ہمارے ائمہ دین خدا اور رسول کے فرض میں یہ فرق کرتے ہیں کہ رسول کا فرض کیا ہوا 'قوی' ہے اور خدا کا فرض کیا ہوا 'اقوی' ہے۔

احکامِ شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہیں، وہ جو کچھ چاہیں واجب کر دیں اور جو کچھ چاہیں ناجائز کر دیں اور جس کو جس حکم سے چاہیں مستثنیٰ فرما دیں۔ میزانِ امام شعرانی، باب الوضوء میں، حضرت سیدی علی خواص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔۔۔

كَانَ الْإِمَامُ اَبُوْحَنِيْفَةَ رضی اللہ عنہ مِنْ اَكْثَرِ الْاَئِمَّةِ اَدَبًا مَعَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَلِذٰلِكَ لَمْ يَجْعَلِ النِّيَّةَ فَرْضًا وَسَمَّى الْوِتْرَ وَاجِبًا لِكَوْنِهِمَا ثَبَتَا بِالسُّنَّةِ لَا بِالْكِتَابِ فَقَصَدَ بِذٰلِكَ تَمْيِيْزَ مَا اَوْجَبَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَاِنَّ مَا فَرَضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَشَدُّ مِمَّا فَرَضَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مِنْ ذَاتِ نَفْسِهٖ حِيْنَ خَيَّرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْ يُّوْجِبَ مَا شَاءَ اَوْ لَا يُوْجِبُ

۔۔۔یعنی۔۔۔

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ ان اکابر ائمہ میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اوروں سے زیادہ ادب ہے۔ چنانچہ انھوں نے وضو میں نیت کو فرض[۱۴] نہ کہا اور نماز وِتر کو واجب کہا، کیونکہ یہ دونوں چیزیں حکم نبوی سے

ہیں، جنکا قرآن میں حکم نہیں۔اس طریقہ سے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے فرض کیئے ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے واجب کیئے ہوئے میں فرق کر دیا۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرض کیا ہوا 'اقویٰ' ہے، اُس سے جس کو حضور ﷺ نے اپنی طرف سے فرض کیا ہو۔جبکہ یہ اختیار حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ہی دیا تھا کہ جس بات کو چاہیں واجب کر دیں اور جسے نا چاہیں نہ کریں۔

---امام شعرانی نے اس اصل کی بنا پر احکام کی چند مثالیں دیتے ہوئے فرمایا:

'کَانَ الْحَقُّ تَعَالٰی جَعَلَ لَہٗ ﷺ اَنْ یُّشَرِّعَ مِنْ قِبَلِ نَفْسِہٖ مَاشَاءَ کَمَافِی حَدِیْثِ تَحْرِیْمِ[۱۵] شَجَرِ مَکَّۃَ فَاِنَّ عَمَّہُ الْعَبَّاسُ رضی اللہ عنہ لَمَّا قَالَ لَہٗ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِلَّاالْاِذْخِرَ[۱۶] فَقَالَ ﷺ اِلَّاالْاِذْخِرَ وَلَوْاَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَمْ یَجْعَلْ لَہٗ اَنْ یُّشَرِّعَ مِنْ قِبَلِ نَفْسِہٖ لَمْ یَتَجَرَّأْ ﷺ اَنْ یَّسْتَثْنٰی شَیْأً مِّمَّاحَرَّمَ اللّٰہُ تَعَالٰی'۔

---یعنی---

حق تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حق دیا تھا کہ اپنی جانب سے جو چاہیں شریعت مقرر کریں۔جیسا کہ حرم مکہ معظّمہ کے درخت اور گھاس سے اِذخر گھاس کو، جب حضرت عباس نے عرض کیا کہ مستثنیٰ فرما دیجئے، تو حضور نے اس کو مستثنیٰ فرما دیا کہ اسکا کاٹنا جائز ہے۔اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے شریعت مقرر فرمانے کا حق آنحضرت ﷺ کو نہ دیا ہوتا تو آنحضرت ﷺ اس بات کی جرأت نہ فرماتے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرما دیا ہے اس میں سے کچھ بھی مستثنیٰ فرمائیں۔

امام شعرانی نے جس حدیث کا تذکرہ فرمایا ہے وہ حدیث صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور اسی صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

سے۔۔۔نیز۔۔۔سنن ابن ماجہ میں حضرت صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا سے بہ سند صحیح مروی ہے۔'میزان الشریعۃ الکبریٰ' میں قانونِ شریعت کی چند قسمیں بتائی ہیں۔ایک وہ جس کیلئے وحی آئی ہے۔۔۔اور۔۔۔

'اَلثَّانِیُ مَااَبَاحَ الْحَقُّ تَعَالٰی لِنَبِیِّهٖ ﷺ اَنْ یَّسُنَّهٗ عَلٰی رَأْیِهٖ هُوَ کَتَحْرِیْمِ لُبْسِ الْحَرِیْرِ عَلَی الرِّجَالِ وَقَوْلُهٗ فِیْ حَدِیْثِ تَحْرِیْمِ مَکَّةَ اِلَّاالْاِذْخِرَوَلَوْلَااَنَّ اللّٰهَ کَانَ یُحَرِّمُ جَمِیْعَ نَبَاتِ الْحَرَمِ لَمْ یُسْتَثْنِ ﷺ الْاِذْخِرَ وَنَحْوُ حَدِیْثِ لَوْلَآاَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ لَاَخَّرْتُ الْعِشَآءَ اِلٰی ثُلُثِ اللَّیْلِ وَنَحْوُ حَدِیْثِ لَوْقُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمْ تَسْتَطِیْعُوْافِیْ جَوَابَ مَنْ قَالَ لَهٗ فِیْ فَرِیْضَةِ الْحَجِّ اَکُلَّ عَامٍ یَّارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَاوَلَوْقُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَقَدْکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُخَفِّفُ عَلٰی اُمَّتِهٖ وَیَنْهَاهُمْ عَنْ کَثْرَةِ السُّوَالِ وَیَقُوْلُ اُتْرُکُوْنِیْ مَاتَرَکْتُکُمْ۔ آه باختصار'۔

۔۔۔یعنی۔۔۔

شریعت کی دوسری قسم وہ ہے کہ حق تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اجازت دیدی کہ اپنی رائے سے جو طریقہ چاہیں قائم فرمائیں۔۔۔مثلاً: مردوں کو ریشم پہننے کو آنحضرت ﷺ کا حرام فرمادینا اور تحریم مکہ کی حدیث میں اِذخر گھاس کو مستثنیٰ فرمادینا۔اگر اللہ تعالیٰ نے مکہ کی ہر جڑی بوٹی کا کاٹنا حرام نہ فرمادیا ہوتا تو اِذخر کو مستثنیٰ کرنے کی کیا حاجت تھی؟اور مثلاً آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ اگر میری امت پر بوجھ نہ ہوجاتا تو میں نماز عشاء کے وقت کو تہائی رات تک ہٹادیتا۔اور۔۔۔مثلاً: جب حضور فریضہء حج بیان فرمارہے تھے اور کسی نے پوچھا کہ کیا ہر سال حج فرض ہے یارسول اللہ؟ تو حضور کا

فرمانا کہ نہیں۔ اور اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال واجب ہو جائے اور تم نہ کرسکو۔ آنحضرت ﷺ کی عادتِ کریمہ تھی کہ اپنی امت پہ آسانی فرماتے اوران کوزیادہ سوال کرنے سے روکتے اور فرماتے کہ مجھ کو چھوڑے رکھو، جب تک تم کوکسی حکم سے آزاد رکھوں۔

امام کی عبارتِ بالا میں نماز عشاء کے مؤخر فرمانے کی جو حدیث ہے اس کو متعدد محدثین نے روایت کیا ہے۔ چنانچہ 'معجم کبیر'، 'طبرانی' میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور 'مسند امام احمد' و'سنن ابوداؤد' و'ابن ماجہ' وغیرہا میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے وہ حدیث مروی ہے اور وہ حدیث جس میں فرمایا کہ، اگر میں ہاں فرمادوں تو ہر سال حج فرض ہو جائے، متعدد کتب صحاح میں موجود ہے۔ چنانچہ 'مسند امام احمد' و'صحیح مسلم' و'نسائی' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور 'مسند امام احمد'، 'ترمذی' و'ابن ماجہ' میں، حضرت امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے اور 'مسند امام احمد' و 'دارمی' و'نسائی' میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور 'ابن ماجہ' میں حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور 'میزان' کا پچھلا مضمون، کہ 'مجھے چھوڑے رہو جب میں تم کو آزاد رکھوں'، یہ بھی 'صحیح مسلم' و'سنن نسائی' میں اس حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہے جس میں فرمایا کہ:

لَوْقُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ

اگر میں کہہ دیتا کہ ہاں، تو حج ہر سال واجب ہو جاتا اور تم نہ کرسکتے

۔۔۔پھر فرمایا: 'ذَرُوْنِیْ مَاتَرَكْتُكُمْ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلُكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاِخْتِلَافِهِمْ عَلٰى اَنْبِيَائِهِمْ فَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوْهُ'

'مجھے چھوڑے رہو جب میں تمہیں آزاد رکھوں کہ پہلی امتیں ہلاک

ہوئیں زیادہ پوچھنے اور اپنے انبیاء کے خلاف منشاء چلنے سے۔تو میں تم کو جس چیز کا حکم دوں، حتی الامکان اس کو انجام دو اور جب میں تم کو کسی چیز سے روکوں، تو اس کو چھوڑ دو۔

---اسکو'ابن ماجہ' نے بھی روایت کیا ہے۔حدیث کا یہ ٹکڑا تفسیر ہے، اس آیہء کریمہ کی جس سے جوابِ دوم شروع کیا گیا ہے---کہ:

---وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ--- ﴿سورۃ الحشر: ۷﴾

رسول جس بات کا حکم دیں، اسکی تعمیل کرو اور جس سے روک دیں، اس سے باز رہو

وللہ الحجۃ السامیہ

---امام احمد قسطلانی 'مواہب لدنیہ' میں فرماتے ہیں:

مِنْ خَصَائِصِه ﷺ بِاَنَّهٗ يَخُصُّ مَنْ شَاءَ بِمَاشَاءَ مِنَ الْاَحْكَامِ

آنحضرت ﷺ کے خصائص سے ہے کہ جس سے جس حکم کو چاہیں خاص فرمادیں۔

---امام جلال الدین سیوطی نے خصائص کبریٰ میں ایک باب وضع فرمایا:

بَابُ اِخْتِصَاصِه ﷺ بِاَنَّهٗ يَخُصُّ مَنْ شَاءَ بِمَاشَاءَ مِنَ الْاَحْكَامِ

باب اس بیان میں کہ آنحضرت ﷺ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس حکم سے جس کو چاہیں خاص فرمادیں۔

---امام قسطلانی نے اس کی نظیر میں پانچ واقعے ذکر کئے، امام سیوطی نے اس پر مزید پانچ کا اضافہ کیا اور حضرت مجدد مائۃ حاضرہ نے پندرہ بڑھائے۔میں ان میں سے چند واقعات بلانقل عبارت، بخیالِ اختصار، نقل کرتا ہوں اور ہر ایک کا حوالہ دیتا ہوں، تا کہ جو چاہے اصل کتاب سے، اصل عبارت کو دیکھ لے۔

پہلی نظیر: حضرت ابو بردۃ رضی اللہ عنہ کیلئے چھ مہینہ کی بکری کی قربانی آنحضرت ﷺ نے جائز فرمادی اور فرمایا لَمْ تُجْزِئْ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَكَ، یعنی آج یہ اجازت سوا تمہارے کسی کیلئے نہیں ہے۔'ارشاد الساری' 'شرح صحیح بخاری' میں اس حدیث کے نیچے ہے

خَصُوصِیَّةٌ لَاتَکُونُ لِغَیْرِہٖ اِذْکَانَ لَہٗ ﷺ اَنْ یَّخُصَّ مَنْ شَاءَ بِمَا شَاءَ مِنَ الْاَحْکَام
---یعنی---آنحضرت ﷺ نے یہ خصوصیت حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کوعطا فرمائی جو دوسروں کیلئے اس حکم کی بنا پرنہیں ہے۔کیونکہ آپ کو اختیار تھا کہ جسے چاہیں خاص فرمادیں۔
حدیث مذکور بخاری و مسلم میں حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

دوسری نظیر: ایک بار حضرت عقبہ ابن عامر کو بھی ششماہی بکری کی قربانی کی اجازت آنحضرت ﷺ نے عطا فرمائی۔یہ حدیث بخاری شریف و مسلم شریف و سنن بیہقی میں مروی ہے۔حضرت شیخ محقق مولانا عبدالحق محدثِ دہلوی قدس سرہٗ 'اشعۃ اللمعات، شرح مشکوٰۃ' میں اس حدیث کے نیچے فرماتے ہیں، 'احکام مفوض بود بوے ﷺ ،یعنی شریعت سپرد تھی آنحضرت ﷺ کے۔

تیسری نظیر: حضرت ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ایک جگہ نوحہ کرنے کی رخصت آنحضرت ﷺ نے دی۔یہ حدیث صحیح مسلم و سنن نسائی و ترمذی و مسند امام احمد میں مروی ہے۔امام نووی اس حدیث کے نیچے فرماتے ہیں، لِلشَّارِعِ اَنْ یَّخُصَّ مِنَ الْعُمُوْمِ مَاشَاءَ، یعنی شارع علیہ السلام کو اختیار ہے کہ عام حکموں سے جو چاہیں خاص فرمادیں۔

چوتھی نظیر: ایک بار حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی آنحضرت ﷺ نے نوحہ کی اجازت فرمائی۔اس واقعہ کو ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

پانچویں نظیر: ایک بار حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو عدّتِ وفاتِ شوہر کا سوگ آنحضرت ﷺ نے معاف فرمادیا۔یعنی چار مہینہ دس ۱۰ دن کے سوگ کو جو واجب ہے، ان کیلئے صرف تین دن کا سوگ رکھا۔یہ واقعہ طبقات بن سعد میں ہے۔

چھٹی نظیر: ایک بار حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ کو بھی نوحہ کرنے کی اجازت آنحضرت ﷺ نے دی۔--- یہ حدیث ترمذی شریف میں ہے۔

ساتویں نظیر: ایک مرتبہ ایک صحابی کو مہر کی جگہ صرف سورۂ قرآن سکھا دینا کافی فرمادیا اور فرمایا: لَایَکُوْنَ لِاَحَدٍ بَعْدَکَ مَهْرًا، یعنی تیرے سوا اور کسی کیلئے یہ مہر کافی نہیں۔ یہ واقعہ 'ابن السکن' میں حضرت ابو النعمان ازدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

آٹھویں نظیر: ایک مرتبہ حضرت خزیمہ ابن ثابت رضی اللہ عنہ کی گواہی کو ہمیشہ کیلئے شہادت کا نصاب کامل فرمادیا اور آیۂ کریمہ: وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ ، سے انکو مستثنیٰ فرمادیا۔ یہ حدیث ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ و مصنف ابن ابی شیبہ و تاریخ بخاری و مسند ابویعلی و صحیح ابن خزیمہ و معجم کبیر طبرانی وغیرہ میں موجود ہے۔

نویں نظیر: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کیلئے روزہ کا کفارہ، یوں جائز فرمادیا کہ اپنے پاس سے اُن کو سوا دو من کھجوریں عطا فرمائیں اور فرمادیا کہ خود کھاؤ اور اپنے گھر والوں کو کھلاؤ، تمہارا کفارہ ادا ہوگیا۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور صحیح مسلم میں اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اور مسند بزاز و معجم اوسط طبرانی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور دار قطنی میں حضرت امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے۔ 'ہدایہ' میں بھی یہ حدیث موجود ہے اور 'سنن ابوداؤد' میں حضرت امام زہری سے منقول ہے۔ اِنَّمَا کَانَ هٰذِهٖ رُخْصَةٌ وَلَوْاَنَّ رَجُلاً فَعَلَ ذٰلِکَ الْیَوْمَ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ بُدٌّمِنَ التَّکْفِیْرِ ، یعنی یہ اجازت خاص اسی شخص کیلئے تھی۔ اگر آج کسی پر کفارہ واجب ہو تو کفارہ ادا کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ امام جلال الدین سیوطی وغیرہ نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔

دسویں نظیر: ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان صحابی حضرت سالم کو اجازت دیدی کہ ایک بی بی صاحبہ کا دُودھ پی لیں اور اسی سے حرمت رضاعت ثابت فرمادی۔ اس واقعہ کو صحیح مسلم و سنن نسائی و ابن ماجہ و مسند امام احمد میں روایت کیا ہے۔ اُمّ المومنین ام سلمہ و دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ: مَانَرٰی هٰذِهٖ

اِلَّا رُخصَةٌ اَرُخَصَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِسَالِمٍ خَاصَةً، یعنی ہمارا یہی اعتقاد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خاص سالم ہی کو اس کی اجازت دی تھی۔ نیز یہ حدیث 'طبقات ابن سعد' و 'حاکم' میں بھی موجود ہے۔

گیارھویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف اور حضرت زبیر ابن عوام رضی اللہ عنہ کو جنکے بدن میں سوکھی کھجلی تھی، ریشمین کپڑے پہننے کی اجازت عطا فرمادی۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

بارھویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو جنابت کی حالت میں بھی مسجد نبوی میں رہنا جائز فرمادیا۔ اس حدیث کو 'ترمذی' و 'ابو یعلی' و 'بیہقی' نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور 'مستدرک و حاکم' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا اسکے متعلق بیان نقل فرمایا ہے۔

تیرھویں نظیر: مخدراتِ اہل بیت پاک کو آنحضرت ﷺ نے بحالت عذرِ ماہانہ مسجد نبوی میں آنا جائز فرمادیا۔۔۔ یہ حدیث 'معجم کبیر' 'طبرانی' 'سنن بیہقی' و 'تاریخ ابن عساکر' میں ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔

چودھویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے حضرت براٗ ابن عازب رضی اللہ عنہ کو سونے کی انگوٹھی پہننی جائز فرمادی۔ یہ واقعہ ابن ابی شیبہ نے بہ سند صحیح ابوالسفر سے روایت کیا ہے۔

پندرھویں نظیر: آنحضرت ﷺ کی اجازت سابقہ سے حضرت سراقہ کو امیر المومنین حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے سونے کے کنگن پہنائے۔ یہ حدیث 'دلائل النبوۃ' و 'بیہقی' میں مروی ہے۔

سولھویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بغیر حاضریٔ جہاد، مالِ غنیمت کا مستحق فرمادیا اور عطا فرمایا۔ یہ حدیث 'صحیح بخاری' و 'ترمذی'

'مسند امام احمد' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

سترھویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اپنی رعایا سے تحفہ لینا، جو سب کیلئے حرام ہے حلال فرما دیا۔ یہ واقعہ 'کتاب الفتوح' میں منقول ہے۔

انیسویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے صرف امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو اجازت دی کہ اپنے بیٹے کا نام اور کنیت وہ رکھیں جو حضور کا نام اور کنیت ہے۔ اس حدیث کو 'امام احمد' 'ابوداؤد' 'ترمذی' 'ابویعلیٰ' 'حاکم' 'طحاوی' 'بیہقی' وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

بیسویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے ایک صحابیہ کو احرام میں شرط لگا لینا جائز فرما دیا کہ جب اثنائے حج میں معذور ہو جانا تو احرام سے نکل جانا، حالانکہ یہ کسی دوسرے کیلئے جائز نہیں ہے۔ یہ حدیث 'صحیح بخاری' 'صحیح مسلم' میں 'مسند امام احمد' 'سنن نسائی' 'صحیح ابن حبان' میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اور 'مسند امام احمد' 'صحیح مسلم' 'ابوداؤد' 'ترمذی' 'ابن ماجہ' 'ابن خزیمہ' 'ابونعیم' 'بیہقی' میں حضرت ضباعۃ بنت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اور 'بیہقی' 'ابن مندہ' میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اور اس قسم کی حدیثیں جن میں حضور نے فرمایا' کہ اگر امت پر گرانی کا خیال نہ ہوتا، تو میں ہر نماز میں مسواک کرنا واجب کر دیتا' یا 'نماز عشاء کا وقت تہائی رات تک ہٹا دیتا' یا 'صحابہ کا بیان کہ اگر مسافر کیلئے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت تین دن سے زیادہ لی جاتی تو آنحضرت ﷺ عطا فرما دیتے'، بکثرت کتب حدیث میں بہ سند صحیح مروی ہیں، جنکی تفصیل کا بہ خیالِ اختصار یہ مقام متحمل نہیں ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا نظائر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی یہی تعلیم تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی عقیدہ تھا کہ قانونِ اسلام، آنحضرت ﷺ کے سپرد

ہے۔جس کو جو چاہیں حکم دیں اور جس کو جس سے چاہیں روک دیں۔اسی طرح ایسی حدیثیں جن میں آیا ہے کہ اَمَرَ[۱۷] رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یا قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یا نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اس قدر ہیں جنکا شمار نہایت دشوار ہے اور جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ارشادِ نبوی کا ہر 'امر و نہی' قانونِ اسلام ہے۔اسی لئے آنحضرت ﷺ کے اسمائے طیبہ سے شارع علیہ السلام بھی ہے۔اور 'شارع' کے معنی ہی 'شریعت ساز' کے ہیں۔

تو اب سوال دوم کا جواب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو شریعت پر اختیار ہے۔ اس اختیار کا بیان قرآن شریف میں بھی ہے، حدیث شریف میں بھی ہے، تصریحاتِ ائمہ میں بھی ہے اور یہی صحابہء کرام کا عقیدہ بھی تھا۔آنحضرت ﷺ کی اس فضیلت سے انکار کرنا ملحدوں اور وہابیوں کی 'بدعت ضلالت' ہے۔اس پر مستفتی کا یہ شبہ کرنا کہ 'شیعہ، ائمہ اہل بیت کو بھی یہی اختیار دیتے ہیں لہٰذا ہم ان کی ضد میں نبی ﷺ کو بھی یہ خداداد اختیار نہ دیں گے'، نہایت شرمناک جرم اور افسوسناک جہالت ہے۔مستفتی کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ بطلانِ[۱۸] مذہب شیعہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ائمہ اہل بیت کو ایسے اختیارات دیتے ہیں جو اللہ اور رسول کیلئے خاص ہیں۔اگر مستفتی کی یہی ضد قائم رہی تو خطرہ ہے کہ آج تو شارع علیہ السلام کو 'شارع' ہونے سے انکار کر دیا، کل کہیں یہ نہ کہہ دے کہ چونکہ شیعہ، ائمہ اہل بیت کو اختیار تشریعی[۱۹] دیتے ہیں۔۔۔لہٰذا ۔۔۔میں اللہ تعالیٰ کو بھی یہ اختیار نہیں دیتا، تا کہ شیعوں سے ضد پوری ہو جائے۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ 'پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوانی' اسی کو کہتے ہیں۔اور 'شیعہ' کو مستفتی نے 'حضراتِ شیعہ' لکھ کر خود اپنی جماعت کو دکھ پہنچایا، اس کا ذمہ دار خود مستفتی ہے۔اسی طرح 'اہل سنت و جماعت' کو 'اہل سنت والجماعت' لکھ کر دوعدد جہالتوں اور آخر استفتاء میں صرف انگریزیِ تاریخ بلا وجہ لکھ کر پیروی سنت نصاریٰ کا ذمہ دار خود مستفتی ہی ہے۔

اَللّٰھُمَّ احفِظْنَا مِنَ الْجَھْلِ وَالْجُھَّالِ

ضروری ہدایات

اللہ تعالیٰ کو تو تمام شریعت پر ہر قسم کا اختیار بالذات ہے، لیکن نبی کریم ﷺ کو جو کچھ اختیار ہے وہ اللہ کی عطا سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس طرح مختار ہے کہ خود اپنا حکم جب چاہے منسوخ فرمادے، اسی طرح وہ مختار ہے کہ اپنے نبی کا حکم برقرار رکھے یا مسترد فرمادے۔۔۔یعنی۔۔۔حکم نبوی کا 'واجب التعمیل' ہونا حق اُمت میں ہے کہ اگر حکم نبوی کو اللہ تعالیٰ نے مسترد نہ فرمایا تو امت کیلئے واجب التعمیل ہے۔ لہٰذا آیہ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ۔۔۔الخ۔۔۔وغیرہا[۲] سے مسئلہ اختیار نبوی پر کوئی خلاف اثر نہیں پڑتا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مستفتی نے نماز معاف فرمانے پر غصہ میں صرف نسخ کا بے محل اور لغو و مہمل شبہ کیا، لیکن جس جماعت سے مستفتی کا بابِ عقائد میں تعلق ہے، اسکے امام و پیشوا یعنی مولوی عبد الشکور صاحب لکھنوی، سابق ایڈیٹر 'النجم' نے جب اس حدیث کو سنا تو بکمال مدریت آنحضرت ﷺ کو بے لکنت زبان سے لفظ 'عبد باغی' یعنی 'بندۂ سرکش' سے تعبیر کیا اور اس لفظ کو لکھ کر اپنے دستخط کے ساتھ مناظرہ کچھوچھہ شریف میں میرے حوالہ کر دیا۔ جو رودادِ مناظرہ کچھوچھہ شریف' میں مدت ہوئی چھپ چکا ہے اور جسکی اصل محفوظ ہے۔

'حال ایمان کا معلوم ہے بس جانے دو'

اسی قسم کے دوسرے کفریات[۲۱] اور بارگاہِ نبوی میں گستاخیاں ہیں، جنکی بنا پر عرب و عجم کے علمائے اسلام نے بالاتفاق فرمایا کہ ان لوگوں کو اسلام سے کوئی واسطہ

نہیں۔ انکے پاس بیٹھنا، ان کے ساتھ کھانا پینا، ان کی عیادت کرنا، ان کے پیچھے نماز پڑھنا، اور انکے جنازہ پرنماز پڑھنا، سخت حرام[۲۲] اور گناہ ہے۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں کی ہدایت فرمائے کہ وہ دشمنانِ عظمت رسول کو اپنے دشمنوں سے زیادہ بدتر جانیں۔ وَتَمَامُ التَّفْصِيْلِ فِی الْكُتُبِ الْمُبَارَكَةِ اَلْاَمْنُ وَالْعُلٰى وَحَسَّامُ الْحَرَمَيْنِ وَالصَّوَارِمُ الْهِنْدِيَّهُ هٰذَامَاعِنْدِی وَالْعِلْمُ عِنْدَاللّٰه تَعَالٰى وَاللّٰهُ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ جَلَّ مَجْدَهٗ اَتَمَّ وَاَحْكَمَ۔۔۔ چونکہ اس تحریر نے باوجود اختصار، رسالہ کی صورت اختیار کی۔ لہٰذا اس کا نام 'التحقیق البارع فی حقوق الشارع' رکھا۔۔۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا

کتبه عبده المذنب

ابوالمحامد سید محمد الاشرفی الجیلانی غفرلہ

۱۶ صفر المظفر یوم دوشنبہ مبارکہ ۱۳۵۷ھ

کچھوچھہ شریف۔ ضلع فیض آباد

شرح وحواشی

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّ مُسَلِّمًا

﴿۱﴾۔۔۔علامہ ابن جوزی 'مسند امام احمد' میں 'موضوع حدیث' کا ہونا بھی بیان کرتے ہیں تو پھر اس کی کسی حدیث کا کیا اعتبار رہ گیا؟۔۔۔مذکورہ بالا اس ذہنی خلش کو دور کرنے کیلئے اتنا ہی کہنا کافی ہے، کہ علامہ موصوف نے تو 'بخاری شریف' کیلئے بھی کہا ہے کہ اس میں 'موضوع حدیث' موجود ہے۔تو پھر 'بخاری' بھی نا قابل اعتبار ہوگئی۔ یوں ہی 'ضعیف' حدیثیں، 'بخاری شریف'، 'مسلم شریف'، بلکہ تمام 'کتب صحاح' میں ہیں، تو کیا سب کو نا قابل اعتبار قرار دے دیا جائے؟۔۔۔لہٰذا ہر اہل فہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ کسی کتاب میں 'ضعیف' یا 'موضوع' حدیث کا ہونا اس کی دوسری 'صحیح' روایتوں کیلئے نقصان دہ نہیں۔۔۔ثانیاً: علامہ موصوف کا کسی حدیث کو 'موضوع' کہہ دینا کوئی حجت نہیں، کہ 'موضوع' قرار دینے میں علامہ موصوف حد سے متجاوز ہو گئے ہیں۔۔۔ثالثاً: علامہ موصوف نے خاص کر اس حدیث شریف کو، جسے حضرت قبلہ گاہی علیہ الرحمۃ والرضوان نے 'مسند شریف' سے نقل فرمایا ہے، 'موضوع' یا 'ضعیف' نہیں کہا ہے۔ بلکہ صرف یہی کہا ہے کہ 'مسند امام احمد' میں 'موضوع' حدیث بھی ہے۔ یہ قول اس بات کو مستلزم نہیں کہ یہ حدیث مذکور 'موضوع' یا 'ضعیف' ہو ۔۔۔الحاصل۔۔۔علامہ موصوف کا قول اس حدیث کی صحت کیلئے مضر نہیں۔

﴿۲﴾۔۔۔حضرت امام احمد ابن حنبل ان مجتہدین علی الاطلاق سے ہیں جنکی جلالت شان کسی مدح وثنا سے کہیں بالاتر ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔یعنی اس حدیث شریف کی سند ایسی ہے جسکے تمام راوی وہ ہیں جن

سے امام مسلم اپنی 'صحیح' میں روایت کرتے ہیں اور سب کے سب شرط مسلم پر ثقہ ہیں۔

﴿۴﴾۔۔۔حضرت محمد ابن جعفر کے متعلق علامہ ابن حجر نے اپنی کتاب، 'تقریب التہذیب' (ص۳۱۶) میں لکھا ہے کہ ان سے 'صحاحِ ستہ' کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں روایتیں ہیں وہ 'ثقہ صحیح الکتاب' ہیں۔ ان میں ایسی کوئی بات نہیں جو ثقہ ہونے کے منافی ہو۔ وہ تبع تابعین کے اس طبقہ سے ہیں جس میں امام شافعی وغیرہ ہیں۔۔۔۔ 'خلاصہ تہذیب الکمال' (ص۲۸۲) میں ہے کہ محمد بن جعفر امام شعبہ کی خدمت میں بیس ۲۰ برس حاضر رہے۔ وہ عون وحسین، معلم وابن جریج وابن عرویہ سے، اور ان سے امام احمد وابن مدینی وابن معین وابن راہویہ وقتیبہ اور بکثرت ائمہ راوی ہیں۔ ابن معین نے ان کا لقب 'اصح الناس کتاباً' دیا ہے۔ ابوداؤد کے نزدیک ۱۹۴ھ سال وفات ہے۔

﴿۵﴾۔۔۔امام شعبہ کے متعلق 'تقریب' (ص۱۶۹) میں ہے کہ ان سے بھی صحاحِ ستہ کے علاوہ دوسری کتب احادیث میں روایتیں ہیں۔ یہ ثقہ ہیں، حافظ ہیں، متقن ہے۔ یعنی صحابہ کرام کے بعد 'مرتبہ ثانیہ' والے ہیں اور 'امیر المومنین فی الحدیث' اور عابد ہیں۔

﴿۶﴾۔۔۔حضرت قتادہ کے متعلق اسی 'تقریب' (ص۳۰۵) میں ہے کہ ان سے 'صحاحِ ستہ' کے علاوہ دوسری کتب احادیث میں بھی روایتیں ہیں۔ 'یہ ثقہ ثبت' ہیں۔ انکا مرتبہ صحابہ کرام کے مرتبہ کے بعد ہے، اور یہ 'طبقہ رابعہ' کے، جس میں امام زہری جیسے لوگ ہیں، سردار ہیں۔

﴿۷﴾۔۔۔نصر ابن عاصم، ان کے متعلق علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان سے امام بخاری نے اپنی بعض تصنیفات میں اور امام مسلم نے اپنی 'صحیح' میں اور امام نسائی نے اپنے 'سنن' میں اور ابن ماجہ نے اپنی 'سنن' میں حدیثیں روایت کی ہیں۔ یہ

ثقہ ہیں اور اس طبقہ سے ہیں، جن میں خواجہ حسن بصری اور امام ابن سیرین ہیں۔
(تقریب: ص۳۷۳)

فائدہ۔۔۔حدیث زیر بحث کی سند، اگر راویوں کے نام کی جگہ ان کے اوصاف سے بیان کی جائے، تو یہ ہوئی:۔ 'قَالَ الِا مَامُ الْمُجتَهِدُ حَدَّثَنَا ثِقَةٌ ثَنَا اِمَامٌ ثِقَةٌ حَافِظٌ مُتَّقِنٌ اَمِيْرُالْمُؤْمِنِيْنَ فِي الْحَدِيْثِ عَابِدٌ عَنْ ثِقَةٍ ثَبْتٍ رَأْسِ الطَّبْقَةِ الرَّابِعَةِ عَنْ ثِقَةٍ تَابِعِيٍّ عَنْ صَحَا بِيٍّ' رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔۔۔یعنی۔۔۔ایک امام مجتہد سے ایک ثقہ نے حدیث بیان کی، اور ان سے ایک ثقہ، حافظ متقن، فن حدیث کے امیر المومنین متقی نے، وہ روایت کرتے ہیں ایک ثقہ ثبت، سردار طبقہ رابعہ سے، اور وہ راوی ہیں ایک ثقہ تابعی سے، وہ ایک صحابی سے۔۔۔الحاصل۔۔۔یہ ایک ایسی نفیس اور ثقہ سند ہے جو اپنے اندر گنجائش کلام نہیں رکھتی ہے۔

﴿۸﴾۔۔۔امام جلیل، حافظ الحدیث، علامہ جلال الدین سیوطی کی جلالت شان، محتاج تعارف نہیں۔ یہ امت مسلمہ کی ایک اہم اور گرانقدر شخصیت تھی، جو اپنے دور میں اور اپنے بعد آنے والے ہر دور میں، مرجع اہل تحقیق وارباب علم رہی۔ ممکن ہے کہ کوئی از راہ بغض وعناد، یہ کہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی بعض تصنیفات میں تحریر کیا ہے، کہ امام جلال الدین کی تصانیف محتاج غور وفکر ہیں۔ لہٰذا نبی کریم کے فضائل مخصوصہ کو ثابت کرنے کیلئے 'مسند شریف' کی جو حدیث زیر بحث اپنی کتاب 'انموذج اللبیب' میں نقل کی ہے وہ خود محل نظر ہوگئی۔ اسکے جواب میں اولاً میں یہ عرض کروں گا، کہ ایک ہے 'بابِ عقیدہ وعمل' اور دوسرا 'بابِ فضائل'۔ کسی عقیدہ وعمل فہمی کے ثبوت میں نہایت غور وخوض اور تفقہ تام کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اصطلاح میں 'عقیدۂ ضروریہ' ثابت کرنے کیلئے دلیل قطعی الثبوت وقطعی الدلالت چاہیئے۔ اور کسی عمل فہمی کے ثبوت کیلئے حدیث صحیح کی ضرورت ہے۔ اور اس بارے میں 'بخاری

شریف' سے لیکر ہر چھوٹی بڑی کتاب کا ایک ہی نمبر ہے۔۔۔مثلاً: یہ عقیدہ' کہ ایمان زیادتی ونقصان کو قبول کرتا ہے' یا یہ عقیدہ' کہ سیدہ خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بیزار تھیں، قبول نہ کیا جائے گا۔ گو ایسے عقائد کا ثبوت 'بخاری شریف' ہی کی حدیثوں سے کیوں نہ دیا جائے!

اسی طرح اس عمل کا حکم دینا کہ، وتر ایک ہی رکعت ہے، یا اس عمل کا حکم کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنی واجب ہے، تسلیم نہ کیا جائیگا۔ گو ثبوت میں 'بخاری شریف' کی حدیثیں کیوں نہ ہوں! اسلئے کہ عقیدہ وعمل کے ثبوت کیلئے امت اسلامیہ ان شخصیتوں کی محتاج ہے جنکی 'امامت تفقہ' اور 'مہارتِ اجتہاد' پر سب کا اجماع ہو۔ لیکن جہاں عقیدہ وعمل کے ثبوت میں اتنی تنگی وشدت ہے، وہاں 'بابِ فضائل' میں اتنی وسعت ہے کہ کسی 'مسلم الثبوت' یا کسی 'مقبول عمل' کی فضیلت ثابت کرنے کیلئے بالاتفاقِ ائمہ حدیث، 'حدیث ضعیف' بھی حجت ہے۔ اور 'حدیث غریب' تو بدرجہ اولیٰ حجت ہے، کہ ہر 'غرابت' 'صحت' کے منافی نہیں ہوا کرتی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے عقیدہ وعمل کے ثبوت میں تصانیف امام جلال الدین کو محتاج غور وفکر بتایا ہے، نہ کہ بحث فضائل میں۔

﴿ثانیاً﴾۔۔۔قرآن کریم کے سوا کوئی ادنیٰ یا اعلیٰ ایسی کتاب نہیں، جس میں کوئی نہ کوئی خامی نہ ہو۔ اور کوئی غیر نبی ایسا نہیں جس میں 'مزلتہ اقدام' کا امکان نہ ہو۔ اگر اسی امکان کی بنیاد پر سب کی تصنیفوں کو ناقابل اعتماد کہہ کر الگ کر دیا جائے، تو پھر قرآنِ کریم کے سوا دوسری کتاب قابل حجت کیسے رہ سکے گی۔

﴿ثالثاً﴾۔۔۔شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ نہیں فرمایا ہے، 'انموذج اللبیب' کی حدیث زیر بحث، محتاج غور وفکر ہے اور اسکی صحت میں گنجائش کلام ہے۔ لہٰذا شاہ صاحب کا صرف اتنا کہہ دینا کہ تصانیف امام جلال الدین محتاج غور وفکر ہیں، اس

حدیث کی صحت کیلئے نقصان دہ نہیں۔

﴿ رابعاً ﴾۔۔۔حدیث زیر بحث صرف 'انموذج اللبیب' ہی میں منقول نہیں بلکہ 'مسند امام احمد' میں بھی ہے۔اور یہ 'مسند شریف' ،تصانیف امام جلال الدین سے تو ہے نہیں۔ایسی صورت میں شاہ صاحب کا مذکورہ بالا خیال،اس حدیث کیلئے کیسے مضر ہوسکتا ہے۔

﴿ خامساً ﴾۔۔۔شاہ صاحب نے جملہ تصانیف امام موصوف کو جو محتاج غور و فکر کہا ہے یہ 'جرح مبہم' ہے اسلئے کہ انہوں نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ کس تصنیف میں کون سی بات اور کس وجہ سے محل نظر ہے۔'جرح مبہم' اگر راویان حدیث میں سے کسی سے متعلق ہو۔۔۔مثلاً: کوئی ناقد حدیث،خصوصاً ابن جوزی وغیرہ یہ کہہ دیں کہ یہ راوی ضعیف ہے،اور وجہ ضعف کی تصریح نہ کریں۔یعنی یہ نہ بتائیں کہ کیوں ضعیف ہے اور اس راوی میں کیا ضعف ہے،تو ایسی جرح کا علمائے اصول کے نزدیک کوئی مقام نہیں۔کیونکہ وجہ ضعف میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ایک چیز کو بعض عیب سمجھتے ہیں اور بعض نہیں۔۔۔مثلاً: تدلیس ،ارسال ،گھوڑے دوڑانا ،مذاق ،نوعمری میں فقہ میں مشغولیت ،کو بعض لوگوں نے راوی کا عیب جانا ہے۔مگر حنفیوں کے نزدیک ان میں سے کچھ بھی عیب نہیں۔ (ملاحظہ ہو نور الانوار:ص۱۹۲)۔اسی طرح متن حدیث یا کسی کی تصنیف سے متعلق 'جرح مبہم' کا کوئی اعتبار نہیں۔

﴿۹﴾۔۔۔نسخ کی صورت یہ ہے۔۔۔مثلاً: اللہ تعالیٰ نے ساری اُمت مسلمہ کو یا بعض افراد مخصوصہ کو کوئی حکم دیا،یعنی ان پر کسی عمل کو فرض فرما دیا۔پھر رسولِ کریم نے ان سب سے جن جن پر وہ حکم فرض تھا، اُس حکم کو ہٹا دیا۔اسی مثال پر 'نسخ قرآن بالقرآن'، 'نسخ قرآن بالحدیث'، 'نسخ حدیث بالقرآن' اور 'نسخ حدیث بالحدیث' کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔رہ گیا کسی حکم کا ساری اُمت مسلمہ کیلئے فرض ہونا اور پھر رسولِ کریم

ﷺ کا سب کیلئے اس کی فرضیت کو باقی رکھتے ہوئے، صرف ایک فرد یا بعض افرادِ مخصوصہ کو اپنے خصوصی اختیارات تشریعی کی بنا پر اُس حکم سے مستثنیٰ قرار دیدینا، اصل حکم کا نسخ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی اس کو نسخ ہی کہنے پر مصر ہے، تو اس نسخ کی نوعیت وہی ہے جس کا ذکر متن کتاب میں ہے۔

﴿۱۰﴾۔۔۔اگر کوئی یہ کہے کہ حدیث زیر بحث میں جن صحابی کا واقعہ مذکور ہے، ان کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔ لہٰذا وہ 'مجہول العدالۃ' ہوئے۔ ایسی صورت میں اس حدیث کا کیا اعتبار رہ گیا؟۔۔۔اسکے جواب میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ مذہب اہل سنت و جماعت میں تمام صحابہ عدول وثقہ اور حجت ہیں۔ اسی لئے 'ائمہ فن اسمائے رجال' صحابی کیلئے محض صحابی لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ کسی صحابی کے اسم شریف کا عدم ذکر انکی عدالت کیلئے مضر نہیں۔ بطور طعن وتبرا کسی صحابی کو 'مجہول العدالۃ' وکذاب کہنا روافض وخوارج کا مذہب ہے۔

﴿۱۲﴾۔۔۔اسلئے کہ جب باب فضائل میں 'حدیث ضعیف' حجت ہے، جیسا کہ حاشیہ نمبر ۸، میں اشارہ گزر چکا ہے، تو پھر 'حدیث صحیح' تو بدرجہء اولیٰ حجت ہے، اس میں کسی کیلئے گنجائش کلام نہیں۔ حدیث زیر بحث چونکہ حدیث صحیح ہے، لہٰذا کسی فتنہء منکر کا کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔

فائدہ نمبر ا۔۔۔صحیح وہ حدیث ہے جس میں چار خوبیاں ہوں۔

﴿۱﴾۔۔۔اسکی اسناد متصل ہوں کہ حضور ﷺ سے لیکر مؤلف کتاب تک کوئی راوی کسی جگہ چھوٹا نہ ہو۔

﴿۲﴾۔۔۔اسکے سارے راوی اوّل درجہ کے متقی و پرہیز گار ہوں۔ کوئی فاسق یا مستور الحال نہ ہو۔

﴿۳﴾۔۔۔تمام راوی نہایت قوی الحافظہ ہوں کہ کسی کا حافظہ بیماری یا

بڑھاپے کی وجہ سے کمزور نہ ہو۔

﴿۴﴾۔۔۔وہ حدیث 'شاذ' یعنی احادیث مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔

﴿حسن﴾۔۔۔وہ حدیث ہے جسکے کسی راوی میں یہ صفات اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں یعنی کسی کا تقویٰ یا قوت حافظہ اعلیٰ درجہ کا نہ ہو۔

﴿ضعیف﴾۔۔۔وہ حدیث جسکا کوئی راوی متقی یا قوی الحافظہ نہ ہو، یعنی جوصفات 'حدیث صحیح' میں معتبر تھیں، ان میں سے کوئی ایک صفت نہ ہو۔

پہلی دو قسمیں یعنی 'صحیح اور حسن'، احکام اور فضائل سب میں معتبر ہیں۔ لیکن 'حدیث ضعیف' صرف فضائل میں معتبر ہے، احکام میں معتبر نہیں۔ یعنی اس سے حلال وحرام احکام ثابت نہ ہونگے۔ ہاں اعمال یا کسی شخص کی عظمت ورفعت ثابت ہوسکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ 'ضعیف حدیث' جھوٹی یا غلط یا گڑھی ہوئی حدیث کونہیں کہتے، بلکہ محدثین نے محض احتیاط کی بناپراس حدیث کا درجہ پہلے دو سے کچھ کم رکھا ہے۔

اگر 'حدیث ضعیف' کسی وجہ سے 'حسن' بن جائے تو وہ بھی مطلقاً معتبر ہے۔ اس سے احکام وفضائل سب کچھ ثابت ہوسکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل چیزوں سے 'حدیث ضعیف'، 'حسن' بن جاتی ہے:

﴿۱﴾۔۔۔دو یا زیادہ سندوں سے روایت ہو جانا اگر چہ وہ سب اسناد ضعیف ہوں۔

﴿۲﴾۔۔۔علمائے کاملین کے دائرہ عمل میں آجانا۔

﴿۳﴾۔۔۔علمائے کرام کے تجربہ اور اولیاء کے کشف سے معلوم ہو جانا۔ کسی عالم، فقیہہ، محدث، کا اُس کو بغیر کسی اعتراض کے قبول کر لینا۔

اسناد، یعنی سلسلہء راویانِ حدیث کے ضعف سے 'متن حدیث' کا ضعف لازم نہیں۔ لہٰذا یہ ہوسکتا ہے کہ ایک حدیث ایک اسناد میں ضعیف ہو، دوسری اسناد میں حسن ہو اور تیسری میں صحیح۔ کسی حدیث کے صحیح نہ ہونے سے اُس کا ضعیف ہونا لازم

نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ حدیث حسن ہو۔۔۔ اگر جرح وتعدیل میں تعارض ہوتو تعدیل کو قبول کیا جائے گا۔ یعنی ایک راوی کو کسی محدث نے ضعیف کہا، کسی نے اسے قوی فرمایا، بعض تواریخ سے اسکا فسق ثابت ہوا، بعض نے فرمایا وہ متقی صالح تھا، تو اسے متقی مانا جائے گا اور اسکی روایت ضعیف نہ ہوگی، کیونکہ مومن میں تقویٰ اصل ہے۔

صحیح حدیث کا دارومدار بخاری یا صحاح ستہ پر نہیں۔ صحاح ستہ کو صحیح کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں صحیح حدیثیں زیادہ ہیں۔ یہ نہیں کہ انکے سوا دوسری کتب کی ساری حدیثیں ضعیف ہیں۔ (ملاحظہ ہو جاء الحق: حصہ دوم)

فائدہ نمبر۲۔۔۔ ممکن ہے کہ کوئی ابن تیمیہ کے حوالہ سے یہ کہے کہ اگر کسی حدیث میں ایسا مضمون ہو جو متواترات ومشہورات کے خلاف ہو، تو وہ حدیث 'موضوع' ہے۔ اور جب یہ طے شدہ بات ہے کہ تمام عاقل، بالغ مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز کا فرض ہونا متواترات سے ہے۔ لہٰذا کسی ایک شخص کیلئے دو ہی نماز کی پابندی کا نبی کریم ﷺ کا قبول فرمالینا، اس متواتر کے خلاف ہے۔ اس سے نماز پنجگانہ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

اسکے جواب میں عرض کروں گا کہ۔۔۔ اولاً۔۔۔ یہ قول قطعی غلط ہے کہ اگر کسی حدیث کا مضمون متواترات کے خلاف ہوتو وہ 'موضوع' ہے۔ اسلئے کہ بہت سی حدیثیں منسوخ ہیں اور بہت سی ناسخ۔ 'حدیث ناسخ' کے سبب 'حدیث منسوخ' پر عمل نہیں کیا جائیگا ۔۔۔ بایں ہمہ۔۔۔ ناسخ کا تواتر یا اسکی شہرت، اس حدیث کی صحت کیلئے مضر نہیں جسکا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ لہٰذا اُس حدیث کو موضوع نہیں قرار دیا جا سکتا۔ وہ بہرحال حدیث رسول ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے جو حکم پہلے معمول بہ تھا اب منسوخ ہو گیا۔

قرآن پاک میں بھی کچھ احکام ناسخ ہیں اور کچھ منسوخ، اور ناسخ اپنے منسوخ کے خلاف ہی ہوا کرتا ہے، تو کیا ان ساری آیاتِ منسوخہ کو قرآن کہنے سے انکار کر دیا

جائیگا اور موضوع کہہ دیا جائیگا؟۔۔۔قرآنی آیات ناسخہ اور منسوخہ دونوں کا ثبوت تواتر سے ہے تو گویا ایک متواتر دوسرے متواتر کے خلاف ہوا۔اب اس میں کس کو موضوع کہیں گے اور کس کے کلام الٰہی اور احکام خداوندی ہونے سے انکار کریں گے؟ اگر اس اختلافات کے باوجود کسی کے قرآن ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، تو پھر اگر کوئی حدیث صحیح متواترات ومشہورات کے خلاف ہو، تو اُس کو موضوع کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔اس گفتگو سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ 'مسند شریف' کی حدیث زیر بحث متواترات یا مشہورات کے خلاف ہے، بلکہ ان چند سطروں سے مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ ابن تیمیہ کا بنایا ہوا مذکورہ بالا قاعدہ بالکل غلط ہے۔

قاعدہ تو صرف اتنا بیان کرنا چاہئے تھا کہ بابِ عقائد وفضائل واخبار و بیان میں چونکہ تنسیخ کا کوئی سوال نہیں، لہٰذا اگر کسی حدیث میں ان ابواب سے متعلق کوئی مضمون ہو اور وہ مضمون احادیث مشہورہ متواترہ، یا آیات قرآنیہ کے خلاف ومعارض ہو تو وہ حدیث موضوع ہے۔

تعارض وتخالف کی صورت یہ ہے۔۔۔مثلاً: ایک حدیث سے پتہ چلے کہ حضور نے اس عقیدہ کی تعلیم دی ہے اور اسکو اسلام کا عقیدہ بتایا ہے اور دوسری مشہورات و متواترات یہ کہیں، کہ رسول کریم نے اس عقیدہ کی تعلیم نہیں دی ہے اور اس کو اسلامی عقیدہ نہیں فرمایا ہے، بلکہ اس عقیدہ کی نفی فرمائی ہے۔۔۔یا۔۔۔ایک حدیث سے یہ معلوم ہو کہ۔۔۔مثلاً: حضور کو فضیلت حاصل ہے اور دوسری مشہورات ومتواترات یہ فرما رہی ہوں کہ آپ کو یہ فضیلت حاصل نہیں۔۔۔یا۔۔۔ایک حدیث یہ کہہ رہی ہو کہ حضور نے یہ خبر دی ہے، اس بات کا حکم دیا ہے، اور اس سے روکا ہے اور دوسری مشہورات ومتواترات سے پتہ چلے کہ حضور نے نہ تو یہ خبر دی ہے، نہ اسکا حکم دیا ہے، اور نہ اس سے روکا ہے۔۔۔یا۔۔۔ایک حدیث یہ کہے کہ حضور نے فلاں آیت وغیرہ کا یہ مطلب

بیان فرمایا ہے۔اور دوسری مشہورات ومتواترات یہ بتائیں کہ حضور نے یہ مطلب نہیں بیان فرمایا ہے۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔یہ ہیں ان تخالف وتعارض کی مثالیں جومشہورات ومتواترات کے خلاف کوموضوع قرار دیتی ہیں۔رہ گیا ناسخ ومنسوخ کا تخالف وتعارض،تو یہ منسوخ کوموضوع نہیں قرار دیتا۔لہٰذا اس قاعدہ کو ایسا عام کر دینا کہ اس میں احکامات بھی شامل ہو جائیں جو بذریعہ وحی (خواہ وحی متلو ہو یا غیر متلو) تنسیخ کی گنجائش رکھتے تھے، ایک کھلی ہوئی غلطی ہے۔۔۔ثانیاً: کسی آیت یا کسی حدیث متواتر یا کسی حدیث مشہور میں یہ مضمون نہیں آیا ہے کہ کسی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا ہو کہ صرف دونمازوں پر اسلام قبول کروں گا،تو حضور نے فرمایا ہو کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔

مضمونِ بالا کسی متواتر حدیث،یا مشہور حدیث،یا خبر واحد،میں تو جانے دیجئے، ضعیف حدیث میں بھی نہ ملے گا۔تو پھر حدیث زیر بحث کو متواترات یا مشہورات کے خلاف کیسے کہا جا سکتا ہے؟ حدیثوں میں آیا ہے کہ قبیلہ ءبنی ثقیف نے نماز سے بالکل اور بحیرہ ابن عامر رضی اللہ عنہ نے صرف نماز عشاء سے معافی چاہی تھی،تو اس پر حضور نے یہ نہ فرمایا کہ،اس کا مجھ کوحق ہی نہیں۔میرے متعلق تمہارا یہ اعتقاد شرک ہے۔بلکہ فرمایا کہ بالکل نماز نہ ہونا تو بہت بری بات ہے اور نماز عشاء کا مشکل ہونا،اگر دودھ دوہنے کے خیال سے ہے،تو مطمئن رہو،تم دونوں کام انجام دے لوگے۔ان دونوں حدیثوں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ صحابہ کرام کا یہ عقیدہ تھا،کہ رسول کریم پورے تشریعی اختیارات رکھتے ہیں۔جو چاہیں،جس کیلئے فرمادیں۔ورنہ ان کا ایک نماز،یا تمام نماز سے معافی چاہنا،کیا کارعبث نہ ٹھہرے گا؟ بلکہ سوءِاعتقاد کی طرف بھی مشیر ہوگا۔

حدیث زیر بحث میں ایک طالب ایمان اس شرط پر ایمان لانا چاہتا ہے کہ دو ہی وقت کی نماز پڑھے گا۔ایسی صورت میں رسول کریم ﷺ اپنے خصوصی اختیارات

سے کام لے کر اسکی شرط کو منظور نہ فرمائیں، تو وہ ایمان سے محروم رہ جاتا ہے۔ لیکن ان دو حدیثوں میں جسکی طرف اشارہ کر چکا ہوں، چونکہ مومنین کی ایک جماعت طالب رخصت ہے، لہٰذا رسول کریم ﷺ نے بجائے رخصت کے، اپنے موعظہ حسنہ سے انکے قلوب کو مطمئن کر دیا۔ اسلئے حدیث زیر بحث کو ان دونوں حدیثوں پر یا ان دونوں حدیثوں کو حدیث زیر بحث پر نہ تو قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ ایک دوسرے کو ایک دوسرے کا خلاف و معارض کہا جا سکتا ہے۔ ﴿ثالثاً﴾۔۔۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ عہد پاک نبوی میں کسی ایک شخص پر دو ہی نماز کی پابندی، نبی کریم ﷺ کا قبول فرما لینا، نماز پنجگانہ کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔ اسلئے کہ اس سے نماز پنجگانہ کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

دیکھ لیجئے کہ رمضان کے روزے فرض ہیں اور جو شخص عمداً ایک روزہ توڑ دے تو اُس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے یا دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے، یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ کفارہ تمام اُمت میں مشہورات بلکہ متواترات سے ہے۔ لیکن ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے کہ ایک صحابی نے رمضان المبارک کا ایک روزہ دانستہ توڑ ڈالا اور جب سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا تو حضور نے کفارہ کی تعلیم دی۔ جب صحابی نے عرض کیا مجھ سے تینوں کاموں میں سے ایک بھی نہیں ہو سکتا، تو حضور نے فرمایا بیٹھو۔ اتنے میں، بارگاہ نبوی میں کھجوریں آئیں تو ارشاد فرمایا، اس کو لے لو اور صدقہ دے دو۔ صحابی نے عرض کیا، مجھ سے زیادہ کوئی محتاج ہی نہیں ہے۔ اس پر رحمت مجسم ﷺ مسکرا دیئے، یہاں تک کہ دندان مبارک نمایاں ہو گئے اور ارشاد فرمایا، 'تم ہی کھا لو'۔

یہی حدیث ابن جریج نے امام زہری کے واسطہ سے بھی روایت کی ہے اور اسی حدیث کو اُصول فقہ حنفی کی مشہور کتاب 'نور الانوار' میں 'مقامِ استناد' میں ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اُن ایک صحابی کیلئے مراعات فرمانے کو نہ کسی نے یہ سمجھا کہ روزہ رمضان کی

فرضیت کی اہمیت کو کم کرنا ہے، نہ یہی سمجھا کہ حکم، کفارہ کے خلاف ہے، لہٰذا موضوع ہے۔۔۔الحاصل۔۔۔حدیث زیر بحث کا مضمون خلاف متواترات اُس وقت ہوتا جبکہ اس میں نماز پنجگانہ میں سے کسی ایک نماز کو بھی تمام امت اسلامیہ سے معاف کردینا مذکور ہوتا۔

فائدہ نمبر۳۔۔۔اس حدیث زیر بحث کے مضمون کے متعلق آخری بات ابن تیمیہ کے حوالے سے یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ جس حدیث کو ایک دوہی روایت کریں، اور چاہئے تھا کہ بکثرت راوی ہوتے، تو وہ موضوع ہے۔ اسکے جواب میں صرف اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ دو۲ وقت کی نماز والی حدیث ہو، یا کفارۂ صوم والی، دونوں واقعے کے کسی مجمع عام میں ہونے کا کس کو دعویٰ ہے۔جس کو دو۲ وقت کی نماز کیلئے فرمایا اس کو حق حاصل ہے کہ اپنا واقعہ بیان کرے۔کفارۂ صوم والے واقعہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، لہٰذا اس کو بیان فرمادیا۔اور پھر واقعہ میں کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم سے سمجھ لیا تھا کہ حضور ﷺ کو اختیار ہے، جسکو جو چاہیں، حکم دیں۔تو پھر ایک واقعہء جزئیہ کے روایت کرنے پر تمام جماعت کو کیا چیز اُبھار سکتی تھی۔واقعہ کی اہمیت اس کو کہتے ہیں کہ وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے، لیکن نبی کریم نے موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا ہے۔اگر ایسا اہم حکم دو ایک ذریعہ سے ہم تک پہنچتا، تو حیرت ہوتی کہ جس حکم میں ساری امت کو خطاب ہو وہ صرف دو ایک راوی کے پاس ہو۔لیکن جو رعایت کسی ایک شخص خاص کیلئے مختص ہو، اس کو دو ایک نہیں تو کیا دس۱۰ بیس۲۰ ہزار روایت کریں گے۔

﴿۱۲﴾۔۔۔تفسیر جلالین میں زیر آیت کریمہء مذکورہ ہے:

(مَآ اٰتٰىكُمُ) اَعطَاکُم (الرَّسُوْلُ) مِنَ الْفَیءِ وَغَیرِہٖ

(فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا)

مال ہو یا مال کے سوا کوئی حکم ہو، جو رسول دیں اس کو لے لو
اور جس سے روکیں اُس سے باز رہو۔

---تفسیراتِ احمدیہ میں ہے:

(مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ) مَاآتَاكُمْ مِنَ الْفَيْءِ (فَخُذُوْهُ)
لِاَنَّهٗ حَلَالٌ لَّكُمْ اَوْمَاآتَاكُمْ مِنَ الْاَمْرِ فَتَمَسَّكُوْابِهٖ لِاَنَّهٗ وَاجِبُ الطَّاعَةِ
(وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ) اَیْ عَنْ اَخْذِهٖ وَاِيْتَائِهٖ (فَانْتَهُوْا) عَنْهُ

رسول جو مال دیں اس کو لے لو کہ وہ تمہارے لئے حلال ہے
اور جو حکم دیں اس کو اختیار کرو کہ رسول کی اطاعت واجب ہے اور جسکے لینے
اور کرنے سے روکیں اس سے رک جاؤ

---جواہر التفاسیر میں ہے:

'محققان بر آنند که حکم این کلمات عام است ومعنی
وے آنکه هرچه امر فرماید پیغمبر بداں آنرا او اگیرید وفرمان
برید وهرچه نهی کنداز اں بازایستید که امر ونهئ اُوبحق
است۔ هر که مرتکب امر اُوگردو نجات یابد وهر که از نهئ
اُواجتناب نه نمایددر ورطهٔ هلاکت اُفتد۔'

---تفسیر مدارک میں ہے:

'وَالْاَجْوَدُاَنْ يَّكُوْنَ عَامًّافِیْ كُلِّ مَااَتٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ
وَنَهٰى عَنْهُ وَاَمْرُ الْفَئِیِ دَاخِلٌ فِیْ عُمُوْمِهٖ۔'

ٹھیک یہی ہے کہ آیہ کریمہ ہر امر و نہی کو عام ہے،
مال بھی عموم فرمان کے اندر داخل ہے

---تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس میں ہے:

مَااَمَرَكُمْ الرَّسُوْلُ فَاعْلَمُوْابِهٖ وَمَانَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

وَاتَّقُوااللّٰهَ، اِخْشُوااللّٰهَ فِیمَا اَمَرَکُمْ۔

رسول جس کام کا حکم دیں اُس کو بجالاؤ اور جس سے روک دیں اُس سے باز رہو
اور حکم نبی سے مخالفت کرنے میں اللہ سے ڈرو۔

۔۔۔تفسیر بیضاوی میں ہے:

(**وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ**) وَمَآ اَعْطَاکُمْ مِّنَ الْفَئِیْ اَوْمِنَ الْاَمْرِ
(**فَخُذُوْهُ**) لِاَنَّهٗ حَلَالٌ لَّکُمْ اَوْفَتَمَسَّکُوْابِهٖ لِاَنَّهٗ
وَاجِبُ الطَّاعَةِ وَمَانَهَاکُمْ عَنْهُ۔ عَنْ اَخْذِهٖ مِنْهُ
اَوْعَنْ اِتْیَانِهٖ (**فَانْتَهُوْا**) عَنْهُ(وَاتَّقُوااللّٰهَ فِیْ مُخَالِفَةِ رَسُوْلِهٖ)۔

رسول جو مال دیں وہ حلال ہے، یا جو حکم دیں وہ واجب التعمیل ہے
اور جسکے لینے یا کرنے سے روکیں، اُس سے باز رہو
اور رسول کی مخالفت کرنے میں اللہ سے ڈرو۔

۔۔۔تفسیر خازن میں ہے۔

وَهُوَعَامٌ فِیْ کُلِّ مَااَمَرَبِهِ النَّبِیُّ ﷺ اَوْنَهٰی عَنْهُ مِنْ
قَوْلٍ اَوْعَمَلٍ مِّنْ وَاجِبٍ اَوْمَنْدُوْبٍ اَوْمُسْتَحِبٍ اَوْنَهٰی
عَنْ مُحَرِمٍ فَیُدْخِلُ فِیْهِ الْفَئِیُ وَغَیْرُهٗ۔

آیۂ کریمہ عام ہے۔ ہر حکم نبوی کو جسکا بھی حکم دیا، جس سے بھی منع فرمایا
اپنے قول وعمل سے از قسم واجب یا مندوب یا مستحب کے یا حرام کے روک دینے کے
اس میں مال وغیر مال سب داخل ہیں۔

۔۔۔اسی تفسیر خازن، اسی آیۂ کریمہ کی تفسیر میں یہ حدیث بھی ہے جسکی روایت ابوداؤد
ترمذی نے کی ہے:

عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَااَجِدَکُمْ مُّتَّکِئًا

عَلٰی اَرِیْکَتِهٖ یَأْتِیْهِ اَمْرٌ مِّمَّا اُمِرْتُ بِهٖ اَوْ نُهِیْتُ عَنْهُ فَیَقُوْلُ
لَا اَدْرِیْ مَا وَجَدْنَا فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ۔

ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم میں سے کسی کو
اس طرح نہ پاؤں کہ اپنی نشست گاہ پر تکیہ لگائے بیٹھا رہے، اُس تک
میری جانب سے کوئی حکم یا ممانعت آئے، تو کہہ دے کہ میں اس کو نہیں جانتا،
جو کچھ اللہ کی کتاب میں، میں نے پایا اس کی پیروی کی۔

۔۔۔تفسیر روح البیان میں ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ مِنَ الْاَمْرِ مُطْلَقًا فَیْئًا اَوْ غَیْرَهٗ اُصُوْلًا اِعْتِقَادِیَّةً
اَوْ فُرُوْعًا عَمَلِیَّةً **فَخُذُوْهُ** اَیْ فَتَمَسَّکُوْا فَاِنَّهٗ وَاجِبٌ عَلَیْکُمْ۔

رسول تم کو جو بھی حکم دیں مال کا، یا غیر کا، اعتقادی بات کا یا عملی کا،
اُس کو اختیار کرو کہ یہ تم پر واجب ہے۔

۔۔۔تفسیر درِّ منثور میں زیرِ آیۂ کریمہ متعدد حدیثیں منقول ہیں۔ان میں سے چند حدیثوں کا محض ترجمہ ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں:

﴿۱﴾۔۔۔ابن ابی شیبہ وعبد بن حمید ونسائی وابن منذر نے حضرت عبد اللہ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا:
وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔۔۔اور یہ کہ: **مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ** سب نے کہا ضرور فرمایا ہے۔تو حضرت عبد اللہ ابن عباس نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ نے دباء، حنتم، نقیر، مزفت، شراب کے برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔عبد بن حمید نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ

انھوں نے حضرت عمر وحضرت ابن عباس کو سنا، وہ گواہی دے رہے تھے کہ نبی کریم نے دباء، حنتم، نقیر، مزفت، ظروفِ شراب نوشی کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ پھر خود رسول کریم نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی:

---وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ--- ﴿سورۃ الحشر: ۷﴾

﴿۳﴾ ---یہ تیسری حدیث 'دُرِّ منثور' کے علاوہ 'خازن' اور 'روح البیان' میں بھی ہے۔امام احمد ابن حنبل، عبد بن حمید، امام بخاری، امام مسلم، ابن منذر اور ابن مردویہ نے حضرت علقمہ سے روایت کی ہے کہ عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو خوبصورتی کیلئے گودانی والی، گودنے والی، چہرہ کے بال اکھاڑنے والی اور دانتوں میں کھڑکیاں بنانے والی عورتوں پر، جو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیز کو بدلنے والی ہیں۔ اسکی خبر قبیلہ بنی اسد کی اُم یعقوب نامی ایک عورت کو پہنچی، وہ آئیں اور کہا کہ مجھ کو خبر ملی ہے کہ آپ فلاں فلاں پر لعنت بھیج رہے ہیں۔حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ جس پر رسول کریم نے لعنت بھیجی، جو کتاب اللہ میں ہے، اس پر میں کیوں نہ لعنت بھیجوں! ام یعقوب نے کہا کہ میں نے سارا قرآن پڑھ ڈالا اس میں تو کچھ نہیں پایا۔ابن مسعود نے فرمایا اگر قرآن کو پڑھا ہوتا تو ضرور پاجاتیں، کیا اس آیت کو نہیں پڑھا۔

---وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ--- ﴿سورۃ الحشر: ۷﴾

---اُم یعقوب نے کہا یہ تو ہے۔اس پر ابن مسعود نے فرمایا کہ ان حرکتوں سے رسول کریم نے منع فرمایا ہے---ان جملہ تفاسیر سے یہ بات روشن ہوگئی کہ آیت زیر بحث کے عموم میں اموال واحکام سبھی داخل ہیں جس سے کسی کو مجال انکار نہیں---الحاصل--- اپنے مورد خاص کی بنا پر اموال کا اس میں داخل ہونا اسکے عموم سے احکام کو نہیں نکالتا۔

اس مقام پر مناسب ہے کہ قارئین شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے

اس ارشاد کو بھی ملاحظہ کرتے چلیں:

'معنئ رسول رسانندهٔپیغام است (الی قوله)نه آنکه هرقول اُوپیغام خداباشد' وآیه--- وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝--- صریح خاص بقرآن است بدلیل عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝

(تحفہ اثنا عشریہ)

---الحاصل---شاہ صاحب کے نزدیک آیہ وَمَا يَنْطِقُ--الخ میں صرف قرآن کریم داخل ہے، کیونکہ عَلَّمَهٗ--الخ میں اسی قرآن کریم ہی کی تعلیم کا بیان ہے۔اس میں وہ احکام داخل نہیں جو احادیث میں ہیں۔۔اگر عموم نظم کے تقاضہ کو مدّ نظر رکھتے ہوئے آیت کریمہ مَا يَنْطِقُ--الخ کو عام معنی میں رکھا جائے تو وحی کی 'وحی متلوٗ اور 'وحی غیر متلوٗ' کی طرف تقسیم کر کے قرآن و حدیث میں فرق کیا جائے گا جیسا کہ علمائے اصول نے فرق کیا ہے۔اس صورت میں قرآن 'وحی متلوٗ' ہے اور حدیث 'وحی غیر متلوٗ۔یعنی قرآن کی تلاوت نماز میں کی جاتی ہے بخلاف حدیث کے۔درحقیقت احکامِ رسول، احکامِ خداوندی ہیں اور آپ کے فرمان، فرمان ہائے الٰہی، اسی لئے واجب العمل ہیں۔۔۔اب کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ احادیث کے سارے احکامات سیّدنا جبرائیل لے کر آئے لہٰذا ان سے نبی کریم کا بحیثیت شارع کوئی تعلق نہیں۔ اسلئے کہ آیۂ کریمہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ---الآیہ اسکے خلاف ہے۔اس میں وحی الٰہی کے دوسرے طریقے بھی مذکور ہیں۔

﴿ثانیاً﴾---شب معراج موافق فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى ۝ وہاں وحی ہوئی، جہاں تک سیّدنا جبرائیل امین کی رسائی بھی نہیں ہے۔

﴿ثالثاً﴾---اجزائے نبوت میں ایک جزء الہام بھی ہے۔اگر وہ بھی بواسطہ سیّدنا جبرئیل ہے تو اب الہام کا دروازہ بند ہو جانا چاہئے، حالانکہ اولیائے کرام کو بھی

الہام ہوتا ہے۔۔۔نیز۔۔۔علمائے کرام بھی بطور تشکر اکثر فرماتے ہیں:

هٰذَا مَا اَلْهَمَنِیْ رَبِّیْ

﴿رابعاً﴾۔۔۔بخاری شریف کی حدیث 'صَلْصَلَةُ الْجَرَسِ' میں وحی کی کیفیت اس حصر کے خلاف ہے۔

میں نے اس مقام پر کافی تفصیل وتحقیق سے کام لیا ہے، لہٰذا اس آیہء کریمہ کے بعد کی آیات مقدسہ کی تفسیر وتشریح کی چنداں ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ ویسے وہ آیات کریمہ صرف اپنے الفاظ ہی کے ساتھ حضرت قبلہ گاہی کے مدعا کی واضح دلیل ہیں۔

﴿۱۳﴾۔۔۔اس مقام پر ممکن ہے کہ کوئی سوچے کہ چوتھی آیت کریمہ کا نزول محض اسلئے ہوا تھا کہ حضرت زینب نے تفاخر بالنسب کیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کو امتثالِ امر خداوندی میں اس تفاخر بالنسب کو دور کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا آپ نے حضرت زینب کو حضرت زید کا پیغام دیا۔ انھوں نے انکار کر دیا، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ اسکے جواب میں عرض کروں گا:

﴿اولاً﴾۔۔۔نہ تو یہاں تفاخر بالنسب کا سوال تھا اور نہ اس پر یہ آیت کریمہ کا نزول ہوا۔ سوال تو صرف اتنا تھا کہ گو بر بنائے مسئلہ کفاءت حضرت زینب انکار کر سکتی تھیں، لیکن پیغامِ نبوی کے بعد انکو اپنے حق شرعی کے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ ہے یا نہیں! اسکا جواب قرآن کریم نے عطا فرمایا۔

﴿ثانیاً﴾۔۔۔اگر کسی کو برطبق مسئلہ کفاءت حق شرعی حاصل ہو اور وہ اپنے حق شرعی کو استعمال کرے تو تفاخر بالنسب ہو جائے تو ایسا حق دینا ہی تفاخر بالنسب کی بنیاد رکھنا ہے، نہ کہ اُس کو دور کرنا ہے۔ لہٰذا تحقیق امر وہی ہے جسکو میں نے اس جواب کے شق اوّل میں بیان کر دیا۔

﴿۱۴﴾۔۔۔حکم الٰہی کو فرض کہنا اور حکم نبوی کو واجب کہنا، حکم نبوی کی اہمیت کو

کچھ کم کرنے کیلئے نہیں ہے، بلکہ یہ محض ادب ہے کہ حاکم حقیقی کے حکم کی تعبیر کسی لفظ سے کی اوران کے احکام کی تعبیر کسی اور لفظ سے کی جنہیں اُس حاکم حقیقی نے اپنے فضل وعطا سے تشریعی اختیارات دیئے ہیں۔ لہٰذا نفس الامر میں دونوں حکموں کی قطعیت میں کوئی فرق نہیں۔ رئیس المنکرین ابن تیمیہ نے بھی 'الصارم المسلول' میں اسکا اعتراف کیا ہے:

" اَقَامَهُ اللّٰهُ مَقَامَ نَفُسِهٖ فِیُ نَهُیِهٖ وَاَمُرِهٖ وَاِخُبَارِهٖ وَبَیَانِهٖ فَلَا یَجُوُزُ الُفَرُقُ بَیُنَهٗ وَبَیُنَ اللّٰهِ تَعَالٰی فِیُ شَیُءٍ مِّنُ هٰذِهِ الُاُمُوُرِ۔"

اللہ نے اپنے نبی کو اپنے امر ونہی اور اخبار و بیان میں اپنا قائم مقام بنایا ہے لہٰذا ان امور میں اللہ اور اس کے رسول کے مابین کوئی فرق کرنا جائز نہیں۔

---بایں ہمہ--- حکم الٰہی 'اقوی' ہے اور حکم نبوی 'قوی'۔ اسلئے کہ حکم الٰہی 'قدیم' ہے اور وہی شرائع واحکام کا حاکم اعلیٰ ہے۔ انبیاء علیہم السلام سے جو حکم ہوتا ہے وہ اسی حکم قدیم پر دال ہے اور یہ ظاہر ہے کہ 'مدلول' قوی ہوتا ہے 'دال' سے، تو اگر 'دال' قوی ہے تو 'مدلول' یقیناً 'اقوی' ہوا۔

﴿ثانیاً﴾---حاکم اعلیٰ کا حکم قوی ہوتا ہے، ماتحت کے حکم سے۔ تو اگر ماتحت کا حکم 'قوی' ہو تو حاکم اعلیٰ کا حکم 'اقوی' ہوا---الحاصل---ایک حکم کی قوت دوسرے حکم پر بِالنَّظُرِ اِلَی الُحَاکِمِ ---ہے نہ کہ--- بِالنَّظُرِ اِلٰی نَفُسِ الُاَمُرِ وَحَقِّ الُقَطُعِیَّةِ وَوُجُوُبِ الُعَمَلِ۔

﴿۱۵﴾---بعض حدیثوں میں آیا ہے--- اِنَّ اِبُرٰهِیُمَ حَرَّمَ مَکَّةَ فَجَعَلَهَا حَرَامًا۔۔ یہاں 'تحریم' سے کیا مراد ہے، اس بارے میں شارحین حدیث کے مختلف قول ملتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ 'تحریم' سے مراد 'دعائے تحریم' ہے۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد 'اعلان حرمت' و 'تبلیغ حکم تحریم' ہے---

نوٹ: اس حاشیہ کے تحت حضرت نے جو کچھ تحریر فرمایا اسے 'تحریم اور فلسفہءِ تحریم' کا عنوان دے کر ایک علیحدہ مقالے کی شکل دے دی گئی ہے، جو اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۷۹ پر موجود ہے۔

﴿۱۶﴾---'حدیث اِذخر' میں اسکی خاص عبارت کی وجہ سے بہت سے امور قابل غور ہیں:

﴿۱﴾---'الا الا ذخر' کوئی مستقل جملہ نہیں اور حضرت عباس کے عرض کرنے سے پہلے جو کچھ آنحضرت فرما رہے تھے، اسکا تعلق اسی سے ہے۔ رہ گیا رسول کریم کا سکوت، یہ محض درمیانِ کلام میں حضرت عباس کی عرضی کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے تھا۔ اسی لئے اذخر اگر 'بدل' ہے تو 'مرفوع' ہے اور اگر 'استثناء بعد النفی' ہے تو 'منصوب' ہے۔

﴿۲﴾---کلام سابق جس میں ممانعت کا حکم تھا ابھی اسکی تعمیل صورت ہونے نہ پائی تھی کہ 'الا الا ذخر' نے حق اذخر میں اس کو 'منسوخ' فرما دیا تو کیا 'قبل تعمیل حکم' اس کا 'نسخ' جائز ہے یا نہیں؟

﴿۳﴾---'مستثنیٰ منہ' اور 'استثنا' کے درمیان سکوت واقع ہوا تھا تو اب یہ 'استثناء' کلامِ سابق سے متصل ہے یا منفصل۔ پھر اگر متصل ہے تو اسکا کیا نتیجہ ہے اور منفصل ہے تو اس کا کیا نتیجہ ہے؟ اس میں ائمہ اصول کا بڑا اختلاف ہے۔

﴿۴﴾---کیا حکم 'منزل من اللہ' محض حرمت قتال ہی کیلئے تھا اور باقی امور آنحضرت خود فرما رہے تھے، یا یہ کہ جو کچھ فرمایا گیا تھا، سب وحی کے ذریعہ سے آیا تھا؟

﴿۵﴾---حضرت عباس نے یہ درخواست کی تھی کہ اذخر کو مستثنیٰ کر دیجئے،

یا بطور تلقین کے عرض کر دیا تھا؟

﴿۶﴾۔۔۔آنحضرت نے یہ استثناء محض حضرت عباس کی درخواست پر فرمایا، یا یہ کہ وہ درخواست کرتے یا نہ کرتے، بہر حال آنحضرت 'الا الاذخر' فرما ہی دیتے؟

﴿۷﴾۔۔۔بر طبق مسئلہ تفویض شارع علیہ السلام استثناء فرمائیں تو اس کیلئے کلام مستقل کی ضرورت ہے یا اسکو حکم الٰہی سے متصل قرار دیا جا سکتا ہے؟

(ماخوذ از فتح الباری)

ان ہی مباحث و اختلافات کثیرہ کی وجہ سے شارحین حدیث نے اس حدیث خاص میں مختلف احتمالات نکالے ہیں۔۔۔عینی میں ہے:

وَقُوْلُهٗ صلی اللہ علیہ وسلم اِلَّا الْاِذْخِرِ یَجُوْزُ اَنَّ

اَوْحٰی اِلَیْهِ تِلْکَ السَّاعَةِ اَوْمِنْ اِجْتِهَادِهٖ صلی اللہ علیہ وسلم

۔۔۔یعنی۔۔۔

ممکن ہے کہ اسی وقت وحی بھیج دی گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حکم اجتہادی ہو

۔۔۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

'چوں المتاس کرد عباس استثنائے اذخر راز آنحضرت وحی آمد پس استثنا کرد و فرمود الا الاذخر مگر اذخر که رواست قطع کردن و در مذهب بعضے آنست که احکام مفوض بود بوے صلی اللہ علیہ وسلم هر چه خواهد و بر هر که خواهد حلال و حرام گرداند و بعضے گویند باجتهاد گفت و اول اصح و اظهر است'

۔۔۔یعنی۔۔۔

جب حضرت عباس نے اذخر کے استثناء کیلئے درخواست پیش کی تو وحی آئی اور آپ نے 'الا الاذخر' کہہ کے استثناء فرما دیا، بعض لوگوں کا مذہب ہے

کہ تفویض احکام کے اختیار سے حضور نے اس کو مستثنیٰ فرمایا اور بعض کہتے ہیں کہ اجتہاد سے کیا۔ پہلا احتمال اصح واظہر ہے۔

۔۔۔ان دونوں شرحوں سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

﴿۱﴾۔۔۔اجتہاد کا استعمال کبھی وحی کے مقابلہ میں ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ عینی نے کیا اور کبھی تفویض کے مقابلہ میں ہوتا ہے، جیسا کہ شیخ نے کیا۔ پہلی صورت میں اجتہاد وتفویض میں معنیً کوئی فرق نہیں، صرف اصطلاحاً اعتباری فرق ہوسکتا ہے۔ لیکن تعبیرات کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی، مآل دونوں کا ایک ہی ہوگا۔ جو احکام بذریعہ وحی نہیں آئے، ان کو خواہ رسول کے اجتہاد سے تسلیم کیا جائے، یا تفویض احکام کے تحت رکھا جائے، بات ایک ہی ہوگی۔ دوسری صورت میں اجتہاد، تفویض سے کوئی الگ چیز ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔'الا الاذخر' کے وحی ہونے کا صرف احتمال ہے، کوئی یقینی امر نہیں۔

﴿۳﴾۔۔۔تفویض احکام کے اختیار سے حضور نے یہ فرمایا ہے، اسکا صرف احتمال ہی نہیں، بلکہ بعض علماء کا مذہب بھی ہے۔ لہٰذا اسکو کفروشرک اور بدعت وگمراہی سمجھنا اسلافِ کرام پر طعن وتشنیع ہی نہیں، بلکہ انکو کافرومشرک اور بدعتی وگمراہ سمجھنا ہوا۔

﴿۴﴾۔۔۔حضرت شیخ نے احتمال وحی کو اصح واظہر فرما کر صرف احتمالِ تفویض یا احتمالِ اجتہاد کی اصحیت واظہریت کی نفی کی ہے، یہ اس بات کو مستلزم نہیں کہ دوسرے احتمالات غلط ہوں۔۔۔الغرض۔۔۔حضرت شیخ کا کلام بھی احتمال وحی کے سوا دوسرے احتمالات کو غلط نہیں بتارہا ہے، چہ جائیکہ شرک وکفر اور بدعت وگمراہی کہے۔

اب رہ گیا ان تمام مباحث واختلافات پر نظر کر کے یہ قرار دینا کہ حضرت عباس کی عرض سے پہلے جو کچھ فرمایا جاتا تھا، وہ سب حکم الٰہی تھا، محض قتال کی خصوصیت نہ تھی اور حضرت عباس کی درخواست سے کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کی وجہ سے سکوت فرمانا

ایسا تھا جیسے کلامِ مستقل کے درمیان سانس لینے یا کسی اچانک وجہ سے سکوت کا وقفہ پیدا ہوجاتا ہے اور 'الا الا ذخر' حضور بہر حال فرمادیتے اور برطبق مسئلہ تفویض کلام مستقل بہتر ہے، اسکو اصح واظہر فرمادینا شیخ محقق کی تحقیق میں بہتر تھا۔ لہٰذا فرمادیا کہ 'الا الا ذخر' بھی بذریعہ وحی آیا، یہی زیادہ ظاہر ہے۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔خاص 'حدیث اذخر' ہی میں اس کی خاص عبارت کی وجہ سے یہ احتمال وحی نکالا گیا ہے اور اس احتمال کو خاص اسی حدیث میں شیخ نے 'اصح واظہر' فرمایا ہے، ایسا نہیں کہ وحی وتفویض اور اجتہاد میں مسلک وحی کو ہر جگہ اصح فرمایا ہو۔ کیونکہ شیخ تو خود مسئلہ تفویض کے قائل ہیں اور اس کو قول صحیح فرمانے والے ہیں۔۔۔

حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ کی قربانی، شش ماہی بکری کی خاص انہی کیلئے جائز فرمادی تھی اور فرمادیا تھا کہ سوائے تمہارے کسی کیلئے ایسی قربانی کافی نہیں۔ (بخاری ومسلم)

۔۔۔اسی حدیث کے تحت حضرت شیخ فرماتے ہیں:

'کفایت آں مخصوص به عقبه ابن عامر است چنانکه درخدع مغز آمد آمده است که ذبح کن توآں راو کفایت نمی کند ازهیچ یکے مگر ازتوده آنحضرت رامی رسد که تخصیص کند بعض احکام رابه بعض اشخاص واحکام مفوض بودبوے برقول صحیح۔' ﴿اشعۃ اللمعات، ج۱﴾

۔۔۔دیکھئے، یہاں صاف فرمایا کہ تمام اقوال میں صحیح قول تفویض کا ہے اور بغیر اس کے کہ کسی کا قول بتائیں خود اپنا مسلک یوں بیان فرمارہے ہیں کہ:

'آنحضرت رامی رسد که تخصیص کند بعض احکام رابه بعض اشخاص'

اس پوری تفصیل کو سمجھ لینے کے بعد اب کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا نہ ہونا

چاہئے کہ جب اس حدیث زیر بحث میں دوسرے بھی احتمالات تھے تو پھر اسکو حضرت قبلہ گاہی علیہ الرحمہ نے مسئلہ تفویض کے ثبوت کیلئے کیوں پیش کیا۔ اسلئے کہ اسکا جواب ظاہر ہو چکا کہ بعض ائمہ نے اس سے مسئلہ ءتفویض کو ثابت فرمایا ہے۔ پھر شیخ محقق قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں بعض کے نزدیک استثناء بر بنائے مسئلہ تفویض ہے، تو جو قوم تفویض کو شرک، اور رسول کو خدا بنانا، کہتی ہوا سکے رد میں اس حدیث کو بھی پیش کرنا، بلکہ صرف اسی ایک حدیث کو پیش کرنا کافی ہے کہ حدیث میں جس جس بات کا احتمال نکلے کوئی بھی نہ شرک ہے، نہ بدعت، اور نہ رسول کو خدا بنانا ہے۔

﴿۱۷﴾۔۔۔ اگر حضور کو شریعت میں اختیار نہیں تو اس قسم کے اِحکام واجب العمل نہ ہونے چاہئیں۔

﴿۱۸﴾۔۔۔ اگر حضور کو شارع نہ مانا جائے تو رفض کو تقویت پہنچتی ہے، کیونکہ روافض یہی کہتے ہیں کہ چونکہ تقسیم میراث قرآن کریم سے ثابت ہے، اسلئے حضور کی تمام املاک کی مالکہ حضرت خاتونِ جنت ہوئیں۔ اسکے جواب میں یہی کہا جاتا ہے کہ چونکہ حدیث میں آ گیا ہے کہ ہم کسی کے مُوَرِّثُ نہیں اسلئے حضور اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

﴿۱۹﴾۔۔۔ حدیث شریف میں ہے، من تَشَبَّہَ بقومٍ فَھُوَ مِنْھُمْ ، جس نے کسی قوم سے تشبیہ کی وہ انہی میں سے ہے۔ اس حدیث شریف کے الفاظ ہی اس امر کی طرف مشیر ہیں جو بالقصد اپنے کو کسی قوم کے مشابہ کرتا ہے اس کا یہ حکم ہے۔ اور اگر مشابہت کا قصد وارادہ نہ ہو تو محض مشابہ ہو جانے سے اس حکم میں داخل نہ ہوگا۔۔۔ یہ حقیقت تو بالکل واضح ہے کہ اپنے کو کسی کے مشابہ کرنا اور ہے اور کسی کے مشابہ ہو جانا اور۔۔۔ یعنی 'تشبیہ' ایک چیز ہے اور 'تشبّہ' دوسری چیز، دونوں کا ایک حکم نہیں۔۔۔ مثلاً: اگر خدا کے وجود کو کوئی اسلئے تسلیم کرے کہ نصاریٰ و یہود اسکے قائل ہیں تو اس شخص کا حشر نصاریٰ و یہود کے ساتھ ہوگا اور اگر خدا کے وجود کو اسلئے مانے کہ یہ ایک حقیقت

ثابتہ ہے، جسکی تعلیم بارگاہِ رسالت سے ملی ہے تو اس کا حشر مسلمانوں کے ساتھ ہوگا۔ اگرچہ وہ اس امر خاص میں نصاریٰ و یہود کے مشابہ ہے۔

﴿۲۰﴾۔۔۔'وغیرھا' سے ان آیات کریمہ کی طرف اشارہ ہے جن میں کسی خاص واقعہ یا حکم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال و جبروت کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً: ایک جگہ نبی کریم ﷺ اور انکے غلاموں کو حکم دیا گیا کہ مشرکین کیلئے دعائے مغفرت نہ کرنا۔۔۔ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا کہ قیدیوں کو معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دینا نبی کو نہ چاہئے۔۔۔ایک آیہء کریمہ میں آیا کہ منافقوں اور کافروں کے جنازہ کی نماز کبھی نہ پڑھنا اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہونا وغیرہا۔۔۔ان آیاتِ کریمہ سے 'مسئلہ تفویض' پر اعتراض کرنے والوں کو اُن آیات پر بھی نظر رکھنی چاہئے جن میں ان کمالات واختیارات اور خصوصیات کا ذکر ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو نوازا ہے اور وہ روش نہ اختیار کرنی چاہئے جو روافض نے صحابہ کرام کے متعلق اختیار کی ہے۔۔۔شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے اس قسم کے استدلال کے متعلق کیا خوب مثال دی ہے:

'شخصے زلات انبیاء علیہم الصوات والتسلیمات از قرآن مجید التقاط نماید مثل عَصىٰ اٰدمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى وسوال حضرت نوح درحق پسر خود و کواکب را پروردگارِ خود گفتن و بدروغ شکست بتاں رانسبت بضم بزرگ کردن وخود را واقع بیمار وانمودن کہ از حضرت ابرہیم صدور یافتہ وقتل قبطی از حضرت موسیٰ وکشیدن ریش حضرت ہارون کہ برادر کلاں و پیغمبر بودند بے تامل وتحقیق کہ از حضرت موسیٰ نیز بوقوع آرد گناہ حضرت داؤد در مقدمہء زن اوریا وعلی ہذا القیاس وگوید کہ در قرآن مجید مطاعن ومثالب انبیاء بہ تواتر وقطعیت ثابت شدہ پس اینہا مستحق نبوت نبودند وایشاں رانیک دانستن خلافِ قرآن کردن است این

شخص بے تمیز ایں قدر نہ فہمید یا فہمید و پردۂ شقاوت بر دیدۂ عقل اوشنید۔ نصوص قطعیہ متواترہ بے شمار از قرآن در مدائح و بیان خو بیہائے حال و قال ایں بزرگواراں و جابجا ثنائے اینہا واقع است اگر در قصہء یا حکمے عتاب برایشاں برائے عبرت دیگراں کردہ باشند وایشاں را تادیب وارشاد نمودہ باشند معارض ومناقض آن قطعیاتِ کثیرہ نمی تواند شد ولابد آنرا محملے است نیک کہ دور از مرتبہ ایشاں کہ بالقطع است نباشد۔ (تحفہء اثنا عشریہ، ص ۳۷۷،۷۴، کید ہشتادو ششم)

اُن آیاتِ کریمہ سے جنکی طرف حضرت قبلہ گاہی نے اشارہ کیا ہے، مسئلہ تفویض کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسلئے کہ جن آیات واحادیث میں اس مسئلہ کا تذکرہ ہے، انھیں یا تو اللہ تعالیٰ پر افتراء قرار دیا جائے گا یا نہیں۔ اگر نہیں تو مسئلہ تفویض ثابت۔ ورنہ قرآن وحدیث، بلفظ دیگر خدا اور سول مفتری ہونگے نَعوذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ ایک مومن کسی حال میں بھی اس آخری معنی کا قائل نہیں ہوسکتا، لہٰذا اب کسی مومن کیلئے سوا اس کے چارۂ کار نہیں کہ وہ مسئلہ تفویض کو حق سمجھ لے۔

حضور قبلہ گاہی نے لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ وغیرہا کے متعلق ضروری ہدایتوں کے تحت جو کچھ فرمایا ہے وہ اس آیت کریمہ وغیرہا کو مسئلہ تفویض کی نفی کیلئے پیش کرنے والوں کے جواب میں کافی ہے، لیکن اسی آیت مذکورہ کی تشریح کے متعلق چند میری بھی گزارشات ہیں جن کو ملحوظِ خاطر رکھنا بہت ہی مفید ہے۔۔۔

﴿۱﴾۔۔۔آیت کریمہ میں لفظ تُحَرِّمُ اصطلاحِ فقہی پر نہیں، بلکہ واقعہ کو دیکھتے ہوئے تحریم کے معنی امتناع کے ہوئے کہ اے حبیب! تم ازواجِ مطہرات کے کہنے سے استعمالِ شہد سے کیوں باز رہو گے؟ تم کو ازواج کا خیال ہے اور مجھ کو تمہاری خوشی کا۔ تم کو شہد پسند ہے، اس کو استعمال کرو۔۔۔ معلوم ہوا کہ اس آیت کریمہ میں

نبی کریم کی شانِ محبوبیت اور بارگاہِ الٰہی میں آپ کی رضا جوئی نمایاں ہوتی ہے۔۔۔
غور تو فرمایئے کہ رسول کریم نے نہ تو استعمالِ شہد کو اُمت کیلئے حرام فرمایا تھا اور نہ یہی فرمایا تھا کہ مجھ پر حرام ہے، بلکہ محض خود استعمال نہ فرمانے کو فرمایا تھا۔ اور ہر ایک کو یہ اختیار تمیزی حاصل ہے کہ جس کو چاہے عمل میں لائے اور جس کو چاہے ترک کر دے ۔۔۔لیکن رحمت خداوندی نے یہ پسند نہ فرمایا کہ ہمارا پسندیدہ رسول، اپنی پسندیدہ چیز کو پسند رکھتے ہوئے بھی کسی غیر ضروری وجہ سے استعمال نہ فرمائے۔۔۔الحاصل۔۔۔
اس آیت کریمہ کو 'مسئلہ تفویض' کی نفی سے تو کوئی تعلق ہی نہیں، بلکہ یہ تو بارگاہِ محبّ میں محبوب کی شان کو اجاگر کر رہی ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔لفظ **تُحَرِّمُ** کو اگر اصطلاحِ فقہی پر رکھا جائے تو اس آیت کریمہ کے معنی یہ ہونگے: 'اے رسول تم نے کیوں حرام کرلیا ہے اس چیز کو جسے اللہ نے تمہارے لئے حلال کر دیا ہے'۔

۔۔۔اس صورت میں بھی ہمارے مطلوب پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسلئے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم نے استعمالِ شہد کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ اب صورت حال، دو۲ حال سے خالی نہیں ہوسکتی۔ یا تو رسول کریم کے حرام فرمانے سے وہ چیز حرام ہوگئی تھی یا نہیں۔ اگر حرام ہوگئی تھی تو مسئلہ تفویض ثابت اور اگر حرام نہیں ہوئی تھی تو پھر **لِمَ تُحَرِّمُ** کہہ کر 'تحریم نبوی' کی تنسیخ کی ضرورت ہی کیا ہے؟
۔۔۔الحاصل۔۔۔اگر **لِمَ تُحَرِّمُ** کے لفظ ہی پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ **لِمَ تُحَرِّمُ** فرمانا، مسئلہ تفویض کی حقانیت پر مبنی ہے۔
اس مسئلہ پر یوں بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ 'تحلیل الٰہی' کی تحریم اور 'تحریم الٰہی' کی تحلیل، تشریعی اختیارات رکھنے والے کے ماسوا سے بالاتفاق کفر ہے اور قرآن نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ رسول کریم نے 'تحلیل الٰہی' کی تحریم کی ہے جو اس امر کی واضح دلیل

ہے کہ رسول کو منجانب اللہ تشریعی اختیارات حاصل ہیں اور مسئلہ تفویض حق ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔مسئلہ تفویض کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ اپنے اور اپنے نبی کے جس حکم کو چاہے مسترد فرمادے اور اگر مسترد نہ فرمائے تو پھر حکم نبوی واجب التعمیل ہے اور وہ بھی حق امت میں کہ امت اس کی پابندی کرے۔ لہٰذا اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ استعمالِ شہد کو حضور نے حرام ہی فرمادیا تھا تو کیا حق امت میں حرام فرمایا تھا؟ اور اگر یہ بھی سہی تو پھر آیہء کریمہ میں اتنا ہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسترد فرمادیا، اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ جس حکم نبوی کو چاہے مسترد فرماسکتا ہے، خود اپنا حکم بھی منسوخ فرمادیا ہے، تو کیا 'حکم منسوخ' قبل نسخ 'واجب التعمیل' نہ تھا! اور جب تھا تو کیا حکم نبوی مسترد فرمانے کے پہلے واجب التعمیل نہ ہوگا اور جب ہوگا تو 'مسئلہ تفویض' کے خلاف اس قسم کی آیتوں سے کیا اثر پڑا؟ بلکہ ان آیات سے 'مسئلہ تفویض' کی مزید تائید ہوتی ہے کہ اگر حکم نبوی حق امت میں واجب التعمیل نہیں ہے تو پھر اسکے استرداد ونسخ کی حاجت ہی کیا ہے اور نسخ کتاب بالسنة بلکہ نسخ سنة بالکتاب کی اصولی بحث ہی بے کار ہوئی جاتی ہے۔

انتباہ۔۔۔یہی تقریر ان آیاتِ کریمہ میں بھی جاری ہے جن میں 'منعِ استغفار' و 'عدمِ رہائی اسیرانِ کفار' و 'عدمِ جوازِ نمازِ جنازۂ کفار' کا تذکرہ ہے۔۔۔۔ یہ خیال رہے کہ جن آیاتِ کریمہ میں شریعت کے، شریعت الٰہیہ ہونے کا ذکر ہے اور اس کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، وہ آیاتِ کریمہ 'مسئلہ تفویض' کی نفی نہیں کرتیں۔ اسلئے کہ 'مسئلہ تفویض' بھی شریعت الٰہیہ ہی کا ایک مسئلہ ہے۔

﴿۲۱﴾۔۔۔مثلاً:

﴿۱﴾۔۔۔حضور ﷺ کا علم بچوں، پاگلوں، جانوروں کی طرح یا انکے برابر ہے۔

(حفظ الایمان، مصنفہ مولوی اشرف علی تھانوی)

﴿۲﴾---شیطان وملک الموت کا علم حضور ﷺ سے زیادہ ہے۔
(براہین قاطعہ، مصنفہ مولوی خلیل احمد صاحب ومصدقہ مولوی رشید احمد گنگوہی)

﴿۳﴾---'خاتم النبیین' کا معنیٰ یہ سمجھنا غلط ہے کہ حضور علیہ السلام آخری نبی ہیں، بلکہ یہ معنیٰ ہے کہ آپ اصلی نبی ہیں، باقی عارضی۔ لہٰذا اگر حضور علیہ السلام کے بعد اور بھی نبی آجاویں، تو بھی 'خاتمیت' میں فرق نہ آئے گا۔
(تحذیر الناس، مصنفہ مولوی محمد قاسم صاحب بانی مدرسہ دیوبند)

---یہ عقائد، وہابیہ، دیوبندیہ، کا ایک مختصر ترین نمونہ ہے، جس پر علمائے حرمین طیبین، نیز علمائے عرب وعجم نے تکفیر کا فتویٰ دیا ہے۔ (دیکھئے حسام الحرمین اور الصوارم الہندیہ) اگر ان کے تمام عقائدِ فاسدہ بیان کئے جائیں تو اس کیلئے دفتر چاہئے۔

﴿۲۲﴾---شریعت مطہرہ کے اس حکم شریف پر بعض شریعت سے غافل لوگ 'کلمہ استعجاب' بہ اندازِ 'استہزا' استعمال کرتے ہیں، حالانکہ یہ حکم خود حدیث شریف میں ہے، جسکو عقیلی ابن حضرت انس اور دیلمی، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ بدمذہبوں کیلئے حکم نبوی ہے:

لَاتُجَالِسُوْهُمْ وَلَاتُشَارِبُوْهُمْ وَلَاتُوَاكِلُوْهُمْ وَلَاتُنَاكِحُوْهُمْ
وَلَاتُصَلُّوْعَلَيْهِمْ وَلَاتُصَلُّوْمَعَهُمْ اِنِّىْ بَرِىْءٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ بَرَاءٌ مِّنِّىْ

---یعنی---

انکے پاس نہ بیٹھو، نہ پیو، نہ کھاؤ، نہ نکاح کرو، نہ انکے جنازے کی نماز پڑھو،
نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو، میں ان سے بیزار اور وہ مجھ سے جدا ہیں۔

---حدیث مذکور کے مضمون کی اور بہت سی روایتیں ہیں۔ علامہ ابن حجر نے اپنی کتاب 'الصواعق المحرقہ' میں ان میں سے بعض کو نقل فرمایا ہے، جن میں سے بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ 'ان سے مصافحہ نہ کرو، ان کو سلام نہ کرو، اور اگر مریض ہوں، تو عیادت کیلئے نہ جاؤ'---

تکملہ

رسول کریم کے 'اختیاراتِ تشریعی' کے خلاف منکرین کی بہت ساری موشگافیوں کا جواب، حضرت قبلہ گاہی نے متن کتاب اور میں نے اپنے حاشیہ میں مفصل طور پر دیدیا ہے۔ منکرین کچھ سوالات اور بھی کر سکتے ہیں، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ان کو جوابات کے ساتھ تحریر کر دیا جائے۔

سوال ۱:۔۔۔ حدیثوں میں ہے کہ ایک صحابی نے 'توریث' کا مسئلہ دریافت فرمایا تو حضور نے 'آیت میراث' کے نزول سے پہلے جواب عطا نہ فرمایا۔ ایک صحابی نے 'لعان' کا مسئلہ دریافت کیا تو حضور نے وحی آسمانی کا انتظار فرمایا اور نزولِ وحی کیلئے دعا فرمائی۔ حضور علیہ السلام کی مرضی تھی کہ رخ بہ کعبہ نماز پڑھیں، مگر آپ نے 'آیۂ تحویل قبلہ' کے نزول سے پہلے رخ بہ کعبہ نماز ادا نہ فرمائی۔ ایک صحابیہ نے 'ظہار' کا مسئلہ دریافت کیا تو حضور نے فرمایا کہ جیسا مجھ کو حکم آئے گا بتادوں گا۔ لہٰذا آپ علیہ السلام شارع نہ تھے اور نہ مسئلہ تفویض ہی حق ہے۔

جواب ۱:۔۔۔ شارع علیہ السلام کے شارع ہونے اور مسئلہ تفویض کے صحیح ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ شریعت منجانب اللہ نہ رہے اور اللہ تعالیٰ حکم فرمانے سے باطل و معطل ہو جائے۔ جہاں تک مسئلہ تفویض کا تعلق ہے، اس کا صحیح و حق ہونا اس پر موقوف ہے کہ تمام شریعت کو منجانب اللہ ہونا مان لیا جائے۔ کیونکہ تفویض کا مطلب یہ ہے کہ شارع علیہ السلام کو حق ہے کہ جس کو چاہیں، جس حکم سے چاہیں، خاص فرما دیں۔ جس قانون سے چاہیں مستثنیٰ فرما دیں۔ تو جب تک کوئی عام نہ ہوگا، تخصیص کسی چیز کی ہوگی، جب تک مستثنیٰ منہ نہ ہوگا، استثنا کس چیز سے کیا جائے گا۔ اسی

تخصیص واستثنا کے اختیار کو 'مسئلہ تفویض' کہتے ہیں اور تفویض ہی کا تقاضہ ہے کہ شریعت کے نزول کا انتظار کیا جائے۔ تو انتظار کرنا اور جلد آنے کیلئے التجا کرنا مسئلہ تفویض کی حقانیت کیلئے مضر نہیں۔ غور تو کیجئے کہ اگر نبی کریم نے 'آیہء میراث' کا انتظار فرمایا تو اس کے نزول کے بعد گروہِ انبیاء کو مستثنٰی بھی فرمادیا، تو کیا استثنا فرمانا انتظار کے منافی ہوگیا۔ اسی طرح اگر حضور اکرم نے 'آیہء تحویل قبلہ' کے نزول کا انتظار فرمایا تو بعد نزول وہ کیا جس کو 'تحفہ' میں فرمایا کہ 'حالت سفر وسواری ازیں مستثنٰی است بروایات پیغمبر ﷺ'۔ آخر شارع علیہ السلام کا حالت سواری وسفر کو مستثنٰی فرمادینا کس حق کی بنا پر ہے؟

سوال۲:۔۔۔اگر اس قسم کا اختیار نبی کریم کو ہوتا تو پھر نماز شب معراج میں ابتداءً پچاس وقت کی فرض ہوئی تھی، اس کو بار بار التجا کر کے پانچ وقت کی نماز کیوں کرائی؟ خود ہی جس قدر چاہتے کم کر دیتے؟

جواب۲:۔۔۔اس سوال میں معقولیت اس وقت ہوتی جب کہ کسی بااختیار کو، اس سے جس کا اس بااختیار پر بھی اختیارِ اعلٰی ہے، بلکہ اختیار اعلٰی والے ہی نے اس کو بااختیار بنایا ہے، التجا کرنا بااختیار کے بااختیار ہونے کے منافی ہوتا۔ اور جب ایسا نہیں، جیسا کہ ظاہر ہے، تو یہ وجہ بھی معقول نہیں۔۔۔غور تو فرمایئے کہ ہر نائب السلطنت کو قانوناً آرڈیننس (ordinance) نافذ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، باایں ہمہ وہ اپنی مرکزی کابینہ سے مشورہ کرتا ہے اور وقت کے مقتضاء کے مطابق اپنا طرز عمل قائم کرنے کی اجازت لیتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے وہ بااختیار ہی رہتا ہے۔۔۔البتہ اگر واقعہء معراج سے یہ نتیجہ نکالا جائے تو اس کے انکار کی گنجائش نہیں کہ جس رسول کی شفاعت والتجا نے پچاس وقت کی نماز کو تمام امت پر پانچ وقت کی نماز کر دیا، اسی کی رحمت ورافت کے اقتضاء نے صرف پانچ۵ کو دو۲ کر دیا۔ کیونکہ جب

اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ زمین تک پہنچتے پہنچتے پانچ وقت کی نماز رہ جائے گی تو پچاس فرض فرمانا اور اس کو بواسطہ نبی پانچ کر دینا، ظاہری طور پر نبی کو مداخلت فی الدین کا حق دینا اور اپنی طرف سے امر شریعت میں رضا جوئی حبیب کو ملحوظ رکھنا ہے۔ اب اگر کسی ایک ہی شخص کی خاطر رضائے حبیب دوؔ نمازوں کیلئے ہو جائے تو امرالٰہی کے اس کے مواقف ہونے میں کیا مانع ہے؟ فرق صرف اس قدر ہے کہ پچاس کو پانچ کرنے کیلئے ارشادِ الٰہی بذریعۂ وحی متلوٗ بھی ہو گیا اور پانچ ۵ کو دوؔ کرنے میں ارشادِ الٰہی بذریعۂ تفویض احکام ہوا۔

یہ بات ذہن نشیں رہے کہ پچاس وقت کی نماز کا مشروع ہونا محض روایت ہی روایت ہے اور جو حکم شرع اس پر پہنچا وہ پانچ وقت کی نماز کا تھا۔ اب اسی پانچ وقت میں مسئلہ تفویض کا حق پیدا ہوتا ہے کہ اس کو دوؔ فرما دیا گیا۔ اگر پانچ وقت تک ہونے میں واقعاتِ مرویہ پیش نہ ہوتے تو پھر حق تفویض کس میں پیدا ہوتا؟ لہٰذا ان واقعات سے مسئلہ تفویض کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سوال۳:۔۔۔ قرآنِ کریم مذکور ہے کہ اقامت دین اور تفرقہ سے بچنے کیلئے حضرت عیسیٰ و حضرت موسیٰ اور حضرت نوح اور خود رسول کریم کو اللہ تعالیٰ نے وصیت فرمائی ہے اور سب کیلئے ایک ہی اصولِ دین مشروع فرمائے، لہٰذا مسئلہ تفویض کا بطلان محتاجِ بیان نہیں۔

جواب۳:۔۔۔ قرآنِ کریم کے ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمام ادیانِ سماویہ، اصولِ دین میں متحد ہیں اور جو ایک دوسرے سے جداگانہ احکام و شرائع ہیں، وہ محض اعمال و فروع میں ہیں۔۔۔ اسکو مسئلہ تفویض کے انکار سے کیا واسطہ! اور پھر یہ استدلال اسکے مقابلہ میں جائز ہے جو کہہ رہا ہو کہ 'شریعت اسلامیہ' اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ لیکن جو یہ کہتا ہو کہ تمام و کمال شریعت اور اسکے جملہ مسائل یہاں تک

کہ مسئلہ تفویض بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور بغیر تمام شریعت کو شریعت الٰہیہ مانے ہوئے تفویض متصور ہی نہیں ہوسکتی، تو ایسے شخص کے سامنے مذکورہ استدلال پیش کرنا کتنی نادانی و بوالعجبی ہے!

سوال۴:۔۔۔قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولِ کریم کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ تمام دینوں پر دین محمدی کو غلبہ دیدے، لہٰذا 'مسئلہ تفویض' غلط ہے۔

جواب۴:۔۔۔اس 'لہٰذا' کے ماقبل کو اسکے بعد سے کیا رشتہ ہے، اسے سائل ہی سمجھ سکتا ہے! مجھے تو صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیجا اور ہدایت ودین حق کے ساتھ بھیجا اور اسی ہدایت ودین حق میں مسئلہ تفویض بھی ہے، تو ایسی صورت میں تفویض کا انکار ہدایت ودین حق کے بھی انکار کے مرادف ہے۔

سوال۵:۔۔۔قرآنِ کریم میں ایک جگہ ہے کہ پیدا فرمانا اور حکم دینا اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ حکم نہیں ہے سوا اللہ تعالیٰ کیلئے، لہٰذا مسئلہ تفویض غلط ہے۔

جواب۵:۔۔۔اس استدلال کے متعلق ایک تاریخی واقعہ سننے کے قابل ہے کہ جب جنگ صفین میں مولائے کائنات نے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو ابن العاص کا 'حکم' ہونا منظور فرمالیا تھا تو خارجیوں نے حضور مولیٰ پر یہی زبان درازی کی تھی کہ چونکہ قرآن کریم میں ہے کہ اِنِ الحُکمُ اِلّاللّٰہِ، حکم نہیں سوا اللہ کیلئے، لہٰذا 'حکم' بنا کر (معاذ اللہ) حضرت مولیٰ کافر ہو گئے۔ مولائے کائنات نے اسکا مختصر سا جواب عطا فرمایا۔۔۔کَلِمَۃُ حَقٍّ اُرِیْدَ بِھاالْبَاطِلُ۔۔۔یعنی۔۔۔آیہء کریمہ تو حق ہے، مگر جس مقصد کیلئے اسے پیش کیا گیا ہے وہ باطل ہے۔ یہ واقعہ جہاں ایک 'درس آموز' حقیقت ہے وہیں سوال مذکور کا جواب بھی ہے۔۔۔قرآن کریم نے بھی بہت سارے مقامات پر غیر خدا کی حاکمیت کی طرف اشارہ بلکہ تصریح کی ہے۔۔۔مثلاً:

الف:--- فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا

ایک 'حَکَم' مرد کی طرف سے اور ایک عورت کی طرف سے بھیجو۔

ب:--- یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ

ج:--- دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ

---یہ دونوں آیتیں حضرت داؤد وحضرت سلیمان کو حاکم بتارہی ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ حکم ذاتی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کیلئے نہیں اور حاکم حقیقی اس پاک پروردگار کے سوا دوسرا کوئی نہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 'مسئلہ تحکیم' اسی اللہ تعالیٰ کی شریعت کا مسئلہ ہے، اسی کے حکم سے اسکے بندے باہمی معاملات میں بحیثیتِ حاکم حکم دیتے ہیں۔ اسی طرح 'مسئلہ تفویض' بھی اسی کے حکم سے ہے۔تفویض کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ منجانب اللہ ہے---اور جو لوگ اس بات پر بہت مصر ہیں کہ غیر خدا کو حاکم نہیں کہہ سکتے، ورنہ شرک ہوجائیگا۔ان سے صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ صرف اپنے حکام ضلع ہی کو لکھ کر بھیجدیں کہ جناب والا کو حاکم کہنا شرک ہے، تو ہم سمجھیں کہ وہ اپنے رنگ کے پختہ ہیں اور جو دل سے گڑھ لیا ہے، اس پر جمے ہوئے ہیں۔لیکن ایسوں کے بل بوتے اور زورِ بازو کو ہم جانتے ہیں کہ حکام کو ایسا لکھنا تو درکنار، ان کو حاکم کہنا بھی نہیں چھوڑ سکتے۔لہٰذا اب آیہء کریمہ کے حصر کی وجہ وہ خود ہی بتائیں!

سوال ۶:---قرآن کریم میں ہے نبی کریم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اپنے رب کے پیغاموں کو تمام وکمال پہنچانے والے ہیں، اپنی امت کے خیر خواہ اور امین ہیں۔اور دوسری جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ اور تیسری جگہ ہے کہ نبی کریم صرف رسول ہیں اور رسول کے معنی قاصد کے ہوتے ہیں، لہٰذا مسئلہ تفویض غلط ہے۔

جواب ٦:۔۔۔اس سوال کا منشاء کچھ ایسا نظر آ رہا ہے کہ سائل کے نزدیک رسالت کسی منصب خاص اور قربِ با اختصاص کا نام نہیں ہے بلکہ رسول محض قاصد کو کہتے ہیں۔ جو پوزیشن ایک چٹھی رساں اور نامہ بَر کی ہوتی ہے وہی رسول کا حال ہے۔ چٹھی رساں کا کام یہ ہے کہ چٹھی دے اور چلا جائے، نہ اس کو کوئی سلام کرے، نہ تعظیم، نہ اس سے کچھ بات چیت کرے، نہ اسکے عمل کی پیروی۔ اسی طرح نہ رسول فرماں روا ہے، نہ مطاع اور نہ کسی تعظیم کے لائق ہے۔ شریعت لا کر دیدی اب سائل کو اس سے کیا واسطہ! معاذاللہ۔۔۔کاش! سائل اسی بات پر غور کر لیتا کہ ایک چٹھی رساں کو بھی کم سے کم یہ اختیار ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نہ ملے تو خط واپس کر دے، خط بیرنگ ہو تو مکتوب الیہ سے پیسے وصول کر لے، وغیرہ۔ اور اگر قاصد ایسا ہو جسکے بارے میں بھیجنے والے نے لکھ دیا ہو کہ یہ قاصد ایسا ہے کہ اسکی خوشی میری خوشی ہے، اسکی اطاعت میری اطاعت ہے، اس کا حکم میرا حکم ہے۔ میرے احکام کو بیان کرنا اور اس کی شرح کرنا اس کا حق ہے۔ اگر یہ قاصد کسی بات میں مراعات برتے تو اس کو اس کا بھی حق حاصل ہے۔۔۔اس اعلان وتشریح کے بعد اگر وہ قاصد اپنے اختیارات کو استعمال کرے تو کیا سائل کے نزدیک وہ قاصد اب بھی قاصد محض ہی ہے؟۔۔۔بیشک 'مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ' کی روشنی میں ہمارے سرکار صرف رسول ہیں، لیکن آپ کی 'رسالتِ عامہ' کا وہ مقام ہے جہاں سے 'عرش اعظم' کی منزل بھی نیچے نظر آتی ہے۔ اگر سائل اس حقیقت کو سمجھ لیتا تو اسکو اپنے سوال کا جواب مل جاتا۔

سوال ۷:۔۔۔اسلام 'دین سماوی' ہے، لہٰذا اسکے سارے احکام سماوی ہونے چاہئیں۔ تو اگر مسئلہ تفویض کو حق مان لیا جائے تو اسلام دین سماوی نہ رہے گا اور اس کے بعض احکام غیر سماوی ہوں گے۔

جواب ۷:۔۔۔ہمیں اسلام کے دین سماوی اور شریعت الٰہیہ ہونے سے

انکار نہیں۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ 'تفویض احکام بشارع علیہ السلام' کی بناء یہی ہے کہ شریعت اسلامیہ شرعِ الٰہی اور دین سماوی ہی ہے۔۔۔ نبی کریم کا ہر امر، ہر نہی، ہر ایجاب، ہر نفی، ہر استثناء اور جو کچھ بھی ہے 'شرعِ الٰہی، باذنِ الٰہی' ہے۔

غور فرمایئے ہزاروں مسائل ہیں، جن میں کسی معاملہء خاص میں قضاءِ قاضی کے بعد وہ حکم اس معاملہ کیلئے عند اللہ متیقن مانا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ شریعت اسلامیہ دین الٰہی نہیں ہے، بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ دین الٰہی میں حسب شریعت الٰہیہ قضاءِ قاضی بھی داخل ہے۔ تو پھر 'تفویض احکام بشارع علیہ السلام' کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ شریعت اسلامیہ دین آسمانی نہیں ہے! بلکہ اسکا مقصد یہ ہے کہ 'تفویض'، شریعت اسلامیہ کی تقدیم چاہتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ قضاءِ قاضی کی بنا پر اس دین کو دین قاضوی نہیں کہہ سکتے لیکن دین الٰہی کو 'دین محمدی' اور شریعت کو 'شریعت محمدیہ' بالضرورۃ کہہ سکتے ہیں، بلکہ کہتے رہتے ہیں۔ نیز یہی اطلاق ظاہر کرتا ہے کہ 'فضیلت تفویض' حق ہے، کیونکہ بر بنائے اجتہاد اگر دین و شریعت کی نسبت کسی کی طرف جائز ہوتی تو پھر مذہب حنفی کو دین حنفی اور شریعت حنفیہ کہنا جائز ہوتا۔ اسی طرح اگر بر بنائے تبلیغ یہ نسبت جائز ہوتی تو شریعت کی نسبت تمام علمائے مبلغین کی طرف صحیح قرار پاتی، لیکن کسی کی طرف دین و شریعت کی نسبت نہ ہونا اور 'دین محمدی' 'شریعت محمدیہ' کہنا جائز اور شائع ہونا خود ایک مستقل دلیل ہے کہ یہ نسبت اُسی فضیلت پر مبنی ہے جس کو 'تفویض احکام بشارع علیہ السلام' کہتے ہیں اور اسی بناء پر نبی علیہ السلام کے سوا مجتہد یا مبلغ کو شارع نہیں کہا جاتا۔ غرض اس دین اسلامی اور شریعت الٰہیہ کا آسمانی، بھی مسئلہ تفویض کیلئے ضروری ہے اور اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا

باسمہ تعالیٰ

ماخذ

شرح وحاشیہ نگاری کے سلسلے میں جن کتابوں سے براہ راست استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست یہ ہے:

(۱) قرآن کریم

(۲) بخاری شریف — امیر المومنین فی الحدیث امام ابوعبداللہ محمد ابن اسماعیل بخاری

(۳) مسلم شریف — امیر المومنین فی الحدیث امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج نیشاپوری

(۴) ابوداؤد شریف — امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی

(۵) ترمذی شریف — امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی

(۶) مسند امام احمد — امام ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل

(۷) مشکوٰۃ شریف — امام شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب عمری

(۸) فتح الباری — امام علامہ ابوالفضل بن حجر عسقلانی

(۹) اشعۃ اللمعات — محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق بن سیف الدین محدث دہلوی

(۱۰) تقریب التہذیب — علامہ ابوالفضل احمد بن علی المعروف بابن حجر

(۱۱) تفسیر بیضاوی — علامہ قاضی ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن عمر البیضاوی

(۱۲) تفسیر روح البیان — فاضل کامل شیخ اسماعیل حقی آفندی

(۱۳) تفسیر مدارک — امام جلیل علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی
(۱۴) تفسیر جلالین — علامہ جلال الدین سیوطی وعلامہ جلال الدین محلی
(۱۵) الصواعق المحرقہ — علامہ شہاب الدین احمد ابن حجر الہیتمی
(۱۶) نورالانوار — علامہ شیخ احمد المعروف بہ ملاجیون جون پوری
(۱۷) تحفہ اثناعشریہ — حضرت علامہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی
(۱۸) البیان الساطع فی تشریع الشارع — حضرت مولانا محمد الیاس ظفرآبادی غازی پوری
(۱۹) جاء الحق وزھق الباطل — حضرت مولانا مفتی احمد یار خان صاحب
(۲۰) حسام الحرمین — مرتبہ للمجدد المائۃ الحاضرۃ الامام احمد رضا
(۲۱) الصوارم الہندیہ — شیر بیشہء اہلسنّت حضرت مولانا حشمت علی خان
(۲۲) حفظ الایمان — مولوی اشرف علی صاحب تھانوی
(۲۳) براہین قاطعہ — مولوی خلیل احمد صاحب انبیٹھوی
(۲۴) تحذیرالناس — مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی

جن کتابوں سے بالواسطہ فائدہ حاصل کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) عینی شرح بخاری — علامہ بدرالدین عینی
(۲) خلاصہ تہذیب الکمال
(۳) ابن جریج
(۴) دیلمی
(۵) انموذج اللبیب — علامہ جلال الدین سیوطی
(۶) تفسیرات احمدیہ — علامہ شیخ احمد المعروف بہ ملاجیوں جونپوری

(۷) جواہر التفاسیر — علامہ محمد عبد الحکیم لکھنوی

(۸) تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس — مرتبہ صاحب قاموس علامہ مجد الدین شیرازی

(۹) تفسیر خازن — علامہ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی معروف بہ خازن

(۱۰) تفسیر در منثور — علامہ جلال الدین سیوطی

(۱۱) عقیلی

(۱۲) الصارم المسلول لابن تیمیہ

تصدیق نامہ

میں نے گلوبل اسلامک مشن، انک، نیویارک، یو ایس اے کی کتاب بنام

مقالاتِ شیخ الاسلام

کی طباعت کے وقت اسکے ہر صفحہ کو حرفاً حرفاً بغور پڑھا ہے۔

تصدیق کی جاتی ہے کہ اس میں موجود قرآن کریم کی آیاتِ کریمہ اور احادیث شریفہ کے الفاظ اور اعراب دونوں بالکل صحیح ہیں۔ اور میرا یہ سرٹیفیکیٹ درستگی اور اغلاط سے پاک ہونے کا ہے۔ دورانِ طباعت اگر کوئی زیر، زبر، پیش، جزم، تشدید یا نقطہ چھپائی میں خراب ہوجائے تو اسکا متن کتابت کی صحت سے تعلق نہیں ہے ۔۔۔ علاوہ ازیں ۔۔۔ کتاب ھذا میں کوئی مضمون ملک وملت کے خلاف نہیں ہے۔

فقط

المصدق

Syed Mohd. Azmat Ali Noor
Research & Registration Officer Auqaf
Sind, Karachi.

سید محمد عظمت علی نوری
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر
(محکمہ اوقاف، سندھ) کراچی

گلوبل اسلامک مشن، انک
نیویارک، یو ایس اے